قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

عیدِ مبارک

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید پر ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

وہی قانون ہے جو اَب اے نوعِ اِنسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، اس ضابطۂ ہدایت کی شکل میں تمہارے پاس آ گیا ہے۔ اس میں، ہر اُس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اِضطراب رکھتی ہے۔ جو، ہر اس قوم کی، جو اسے اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کر لیتی ہے، کامیابیوں کی راہ کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے، اور انہیں سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔ (10:57)

ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مُسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو — یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر (13:36)۔ (10:58)

(مفہوم القرآن، سورۃ یونس: 57-58 سے اقتباس)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص وصفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات واقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار واحکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جون 2019ء

جلد 72 شمارہ نمبر 6

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ہم عیدالفطر کیوں مناتے ہیں؟	ادارہ	4
روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں	ادارہ	8
اندھے کی لکڑی	غلام احمد پرویزؒ	12
دِیا جلائے رکھنا ہے	ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی	26
قرآن پر اعتراضات کے جوابات (گذشتہ سے پیوستہ)	خواجہ ازہر عباس، کراچی	30
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر 27)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	36
قرآنی معاشرہ	عمر احمد عثمانی مرحوم	52
بچوں کا صفحہ: قرآن شریف کی تلاوت	ادارہ	56

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 1 and Chapter 2 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	58

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم عیدالفطر کیوں مناتے ہیں؟

عیدالفطر

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں لیکن اس عید کا تہوار وہ ہے جسے بطور جشن مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے:

''اے نوع انسان تمہارے رب کی جانب سے ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامان پرورش اور منزل انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔'' (10:57)۔

اس کے بعد فرمایا:

''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا بے مثال ضابطہ زندگی مل گیا ہے تم کیا اگر ساری دنیا کے انسان بھی مل کر کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا' لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسی قیمتی چیز کے اس طرح مفت مل جانے پر جشن مسرت مناؤ۔ وہ دولت کہ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔'' (10:58)۔

یہ ہے وہ تقریب جسے بطور جشن منانے کی تاکید خدا نے کی ہے یعنی جشن نزول قرآن اور نزول قرآن کی ابتداء چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (2:185) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا اور عیدالفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔ پورے تیس دن کے روزے تیاری میں۔ یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بال آخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشن مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا ہے کہ۔۔۔ اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمع نورانی کے ذریعے نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (10:57-58)۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے؟ تاریکی میں کسی شے کا مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسی کو سانپ اور سانپ۔ کو بعض

اوقات رسی سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آ جانے سے رسی رسی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔

نزول قرآن سے قبل تاریکیاں:

نزول قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔

یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ دل و دماغ کی تاریکیاں، فکر و نظر کی تاریکیاں یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا منبع یہی تاریکی تھی باقی سب تاریکیاں اس کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اس سوال کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا جس کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں، لہٰذا اس کے صرف چند ایک گوشے ہی سامنے لائے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ نزول قرآن کے وقت انسان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ انسان، انسان کی پرستش کرتا تھا۔ غلامی کا جواء اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔ کہیں ملوکیت کا فولادی پنجہ اس کی رگ جان کو دبائے ہوئے تھا۔ کہیں رہبانیت کی غیر فطری زندگی اس کے دل و دماغ کو بری طرح ناکارہ بنائے ہوئے تھی۔ کہیں سرمایہ دار کی ہوس اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔ یہ تھی انسان کی کیفیت۔

توہم پرستی:

جب قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ خدا کے اس رسول ﷺ کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جا رہا ہے (7:157)۔ ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ ان قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آ سکتا تھا اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے، ان کے سامنے جھکا جائے، ان کی پرستش کی جائے، ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

مقام آدمیت:

خارجی قوتوں کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے کہا کہ تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ۔۔۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ (45:12-13، 31:20) اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع

زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔

سنت اللہ:

یہ قوانین جن کے مطابق یہ بڑی بڑی قوتیں مصروف عمل ہیں' اٹل ہیں' نہ بدلنے والے قوانین ہیں۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ نہ معلوم کس وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں پر ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے' قانون کے مطابق ہوتی رہے گی اور ان قوانین میں کبھی بھی تبدیلی نہیں آئے گی (33:62)۔ یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی تو وہ ایک ہی جست میں مسجود ملائک اور مخدوم کائنات بن گیا۔ انسان کے لئے مجبور محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا' مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں انسان دوسرے انسان کے ظلم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضہ اور ان کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔

حق حکومت:

قرآن کریم آیا اور اس نے اعلان کیا کہ۔۔۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ خدا نے اسے کتاب' حکومت حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو' کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میری محکومی اختیار کرو۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتاب خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو (79-3:78)۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے اس اعلان نے انسان کو کس طرح ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ۔۔۔ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کرو' ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو۔ (12:40) انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی محکومیت کرے اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ یہ تو تھا ملوکیت کا ظلم جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا وہ چاہتا تو اپنے دل و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کے دل و دماغ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مذہبی پیشوائیت:

یہ غلامی تھی مذہبی پیشوائیت کی جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ قرآن کریم نے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ پیران طریقت ہوں یا علمائے شریعت ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے پردے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں (9:34)۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔

یہ خدا سے ورے خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے' راستے میں ہی روک لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ خدا تک پہنچ جائیں یعنی اس کی اس کتاب کو اپنا راہنما بنالیں تو ان خدا کے نمائندوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ زندہ انسان ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے' ان کے حضور منتیں مانتا اور نذانے گزارتا ہے۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا قرآن نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا ''خدا'' سمجھ رہے ہو ان کی حالت یہ ہے کہ۔۔۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے اور اگر وہ بفرض محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی بے خبری کی یہ حالت ہے کہ ان مردوں کو خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے (25:3، 27:65، 5-46:4) لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا۔ یہ انسان کی انتہائی پستی ہے کہ وہ مُردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

منشورِ آزادی:

انسان کو انسان کے آگے جھکانے کی ایک موثر تدبیر یہ تھی کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا حکم منوا لیا جائے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملے میں کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہے۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں' ان کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (6:152، 11:6، 17:31)۔ یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کیا (17:70) اور ان سے کہہ دیا کہ اگر تم قرآنی قوانین پر کاربند ہو گے تو تمہیں ایک ایسا معاشرہ میسر آجائے گا جس میں کیفیت یہ ہو گی کہ تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہو گا نہ خوف و حزن (2:37-38، 7:35، 10:62-64)۔ بلکہ ہر طرح کا اطمینان اور ہر طرح کی سلامتی میسر ہو گی۔

مساواتِ انسانی:

اس میں ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مقابلے کے لئے ایک جیسا میدان ملے گا۔ نہ کسی سے بے جا رعایت ہو گی نہ کسی کے راستے میں رکاوٹ آئے گی۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے اپنی بے عملی سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہر ذاتی اور عمل مسلسل کے مطابق ہو گا (46:19، 8-99:7)۔ یہ نہ ہو گا کہ بڑے باپ کا بیٹا سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی نہ حاصل کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے سکول میں داخل کروانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق برہمن کی خود ساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے نوعِ انسان کو قرآن دیا گیا اور اسے کہا گیا تھا کہ ایسے منشورِ حریت و آزادی کے عطا ہونے پر جشن مناؤ۔

☆.....☆.....☆

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزے ہم پر کیوں فرض کئے گئے ہیں

(مفہوم القرآن، سورۃ البقرہ، آیات 183 تا 188)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡكِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لیکن میدانِ جنگ میں ثبات و استقامت کا سوال ہو، یا معاشرتی اور معاشی دنیا میں نظامِ عدل و مساوات کا قیام، یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تمہیں اپنے آپ پر ضبط ہو۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ تمہارے کسی طبیعی (حیوانی) تقاضا اور بلند انسانی قدر میں ٹکراؤ ہو، تو تم اس قدر کو طبیعی تقاضا پر ترجیح دو۔ نیز تم جفاکشی اور مُشقت طلبی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو، اور زندگی کے سفر میں راستے کے خطرات سے محفوظ رہو۔ یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں (گنتی کا تعین، بجائے خویش، ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے)۔ پھر، جو کوئی تم میں سے مریض ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کر لے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں، لیکن اُس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اُس کے لئے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہئے کہ روزے کے عوض، کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے (اس سے، کم از کم، معذور اشخاص کا قلبی تعلق، اِس اجتماعی فریضہ کے ساتھ قائم رہے گا)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ قانونی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ تم روزہ بہ مشقت نباہ سکتے ہو۔ یہ چیز تمہارے اپنے فیصلہ کرنے کی ہے۔ لہٰذا اپنی حالت کا جائزہ تم خود لو۔ اگر تم دیکھو کہ صورت بَیِّن بَیِّن ہے، تو پھر تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے، خواہ اس میں (مقابلۃً) تھوڑی سی مشقت بھی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جو مقصد روزے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ اُس کے فدیہ سے نہیں ہو سکتا ___ بشرطیکہ تم روزے کی حکمت سے واقف ہو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی ___ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔

پھر سُن لو کہ روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اِس قابل ہو جاؤ کہ، خدا نے جو تمہیں راہ نمائی عطا کی ہے، اُس کے ذریعے تم قانونِ خداوندی کو ساری دنیا کے قوانین سے بلند کر سکو (9:33)۔ اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (2:186)

نہ ہی روزوں کے حکم سے، تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ، مادی لذتوں اور جسمانی ضرورتوں کے ترک کر دینے سے اِنسان خدا کا مُقرب بن جاتا ہے (جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں، مختلف ریاضتوں اور مشقتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے)۔ (اے رسول ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو اُن سے کہہ دیں کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص، اپنی راہ نمائی کے لئے مجھے پکارتا ہے تو، میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اُس کے سامنے آجاتا ہے)۔ لہٰذا، اِن سے کہہ دو کہ قُربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56، 8:24، 16-32:15، 40:60، 42:26)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ دلائل وبراہین کی رُو سے، عقل وفکر کی روشنی میں، زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے چلتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال سے ہوگا (3:194)۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾ (2:187)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی ___ بیویوں سے جنسی اختلاط، ''قربِ خداوندی'' کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصوّر ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ایسا قریبی رشتہ کہ اِن کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (57:27)۔ لہٰذا، خدا کا قانون، اس بارے میں، اِنسانوں کی خودساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، اُن سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم، رات کے وقت، منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنی بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو اور کھا پی بھی سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد، رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم، اِس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تاکہ تم اُلجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سُلجھا سکو، تو پھر تم اِن راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یک سوئی سے معاملاتِ پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔

بس یہ ہیں وہ حدود جو اِس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کردی ہیں۔ اِن کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام وقوانین کو نمایاں طور پر بیان کردیتا ہے تاکہ لوگ اِن کی پوری پوری نگہداشت کرسکیں۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾ (2:188)

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) روزے سے مقصد یہ ہے کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہوجائے کہ تم، زندگی کے ہر گوشے میں، جائز اور ناجائز میں تمیز کرسکو، اور، خواہ تمہاری مفاد پرستی کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) آپس میں ایک دوسرے کا مال، ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جاچکا ہے، تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

روزوں سے تمہاری اس قسم کی تربیتِ ذات مقصود ہے۔

English Translation Projects of Tolue Islam Trust

- Lughatul Quran – Printed on Amazon UK
- Life in the Hereafter – Printed on Amazon UK
- What Is Islam? – Printed on Amazon UK
- The Status of Hadeeth in Islam – Printed on Amazon UK
- The Quranic System of Sustenance – Printed and available in Pakistan
- Did Quaide Azam want to make Pakistan a secular state – Printed and available in Pakistan
- Book of Destiny – Printed and available in Pakistan
- Letters to Tahira – Printed and available in Pakistan
- The Quranic Laws – Printed and available in Pakistan
- Reasons for Decline of Muslims – Printed and available in Pakistan
- What Happened to Islam After Umar (R) – Printed on Amazon UK
- Islamic Way of Living – Printed and available in Pakistan
- Exposition of the Holy Quran – Printed and available in Pakistan
- All English books are available for reading / downloading on following link:
- www.islamicdawn.com/urdu-books/english-books-pdf/

Internet, Website and Social Media Projects

- www.islamicdawn.com
- http://islamicdawn.com/audios/ (For Audio Lectures)
- http://islamicdawn.com/videos/ (For Video Lectures)
- http://islamicdawn.com/magazine/ (For Monthly Tolue Islam)
- http://islamicdawn.com/urdu-books/ (For Urdu Books)
- http://islamicdawn.com/articles/ (For Pamphlets and articles)
- http://islamicdawn.com/urdu-books/english-books-pdf/ (For English Books)
- www.toluislam.com
- www.tolueislam.com
- http://www.tolueislam.org/
- http://www.dailymotion.com/user/tolueislam/1 Dailymotion video channel)
- https://vimeo.com/user18635230/videos (Vimeo Video Channel)
- www.youtube.com/tolueislam (Youtube Video Channel)

https://www.facebook.com/tolueislam.trust (Official Facebook Page)

Phone: 042 35753666, Email: tolueislam@gmail.com

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اندھے کی لکڑی

(عقل سلیم رکھنے والے ہر نوجوان کے نام)

نہیں، سلیم! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں بچپن کے زمانے سے ہم انہیں اسی طرح دیکھتے چلے آرہے ہیں اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انہیں دیکھا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اس زمانے میں ان کی تعداد کچھ کم تھی، اب زیادہ ہوگئی ہے۔ نیز اس وقت، سب سے آگے چلنے والے کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا، اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور روزمرہ کی مشق کے زور پر اپنے جیسے اندھوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ جب میں نے انہیں پہلے پہل دیکھا تھا اس وقت سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر، اس سے پچھلے اندھے کو ترقی (Promotion) مل گئی اور وہ ان کا راہنما بن گیا اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اضافہ ہوگیا۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے ''دلیل راہ'' یا ''مشعل ہدایت'' بن گئی۔ جس طرف اگلا مڑا، پچھلے بھی مڑ گئے۔ جہاں وہ ٹھہرا، یہ بھی ٹھہر گئے۔ جس قسم کی آواز اس نے نکالی انہوں نے بھی اس کی نقل اتار دی۔ یہ ٹھیک ایک وقت پر بھیک مانگنے کے لئے نکلتے ہیں اور دن بھر مقررہ راستوں پر چلتے، شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کی مستقل روش ہے جس پر یہ عمر بھر چلتے رہتے ہیں اور چلتے چلتے قبر تک پہنچ جاتے ہیں اور چونکہ ساتھ ساتھ لائن میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کا سلسلہ دراز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی لائن بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی، نہ ان کی آواز بدلتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی، نہ ان کی آواز بدلتی ہے نہ رفتار۔ جب کبھی ان میں سے کسی پچھلے سے پوچھتے ہیں کہ تم اس راستے پر کیوں جا رہے ہو تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا کہ اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے، اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر چلا کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ پیشرو اب مر چکا ہے۔ اس لئے یہ آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

اندھوں کی قطار:

غور کرنے پر تمہیں نظر آ جائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہ انسانیت پر، روز ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آ رہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام:

ان آنکھوں والوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (23:23)

اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور اس کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انہوں نے نہ تو اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کی تردید کی کوئی دلیل اور برہان پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ: مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۖ (23:24) ہم نے اپنے آباواجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہم حضرت صالح علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (11:61) اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ: اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (11:62) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے، تُو ہمیں اُن کی پرستش سے روکتا ہے؟ یعنی وہی آباو اجداد جنہوں نے حضرت نوح اور حضرت ھود علیہم السلام کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب اُن کے لئے دلیل اور سند بن گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا مر جائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ: مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (21:52) ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم جھکتے ہو؟ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہو؟ سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے؟ اس کے جواب میں ان اندھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (21:53)

انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غصہ تو بہت آیا (اور ہر سمجھدار کو غصہ آئے گا۔) لیکن ان عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ: لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ (21:54) تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن ''کھلی ہوئی گمراہی'' تو اسے ہی نظر آ سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رہا ہو اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے۔ جو آنکھیں بند کر لے اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام:

اور وہ دیکھو سلیم! قوم مدین سے حضرت شعیب علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (11:84) اطاعت اور محکومی صرف خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے؟ وہی جو ان سے پہلے دور کے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (11:87) اے شعیب (علیہ السلام)! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔۔۔ وہی اندھے کی لکڑی!

تم نے دیکھا سلیم! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا رہا ہے؟ اندھے، اس کے سوا کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ ان کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برہان نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دلیل و برہان تو اس کے پاس ہوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر، اپنے انتخاب سے اختیار کیا ہو۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رہا ہو کہ اس کے اباؤ اجداد اسی راستے پر چلا کرتے تھے، اس کے لئے دلیل و برہان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جاتا تو انہی کے راستے پر چلنے لگتا۔

نبی اکرم ﷺ:

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپ ﷺ کو بھی اس کا یہی جواب ملا جو پہلے انبیاءؑ کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضور ﷺ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ: مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ (34:43) یہ شخص چاہتا ہے کہ جن معبودوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۖ (38:7) جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے اپنے پچھلے مسلک و مذہب میں ایسا کہیں نہیں سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۖ (38:7) یہ محض بناوٹ ہے اس کا خود ساختہ دعویٰ ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آ رہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوح علیہ السلام ہوں یا ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام ہوں یا شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں یا

آخرالزماں ﷺ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ (43:22) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ ط (43:24) ان کے رسول ان سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح، روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے تقابل اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (43:23) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہیں کے نقوش پا پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ اندھے کی لکڑی سب سے زیادہ محفوظ اور عافیت رساں ہوتی ہے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ: اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (5:104) اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم پھر بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؟ جواب ملتا کہ بے شک ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ط (5:104) ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

مترفین کا مسلک:

تم نے دیکھا سلیم! کہ شاہراہ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل و متواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے۔ ہر پچھلا اندھا اپنے اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہنما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے برسرِحق ہونے کی دلیل و حجت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود، اس قسم کی اندھی روش کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کا جواب ایک لفظ میں دے دیا ہے وہ کہتا ہے کہ: وَکَذٰلِکَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (43:23) اسی طرح ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ مترفین کے معنی ہیں، وہ لوگ جو خود کچھ کام نہ کرنا چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ سہل انگار۔ محنت سے جی چرانے والے۔ اس میں دونوں باتیں آ گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان کے ذہن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ سوچ سمجھ کر راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو بڑی ذہنی کاوش اور فکری جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے برعکس اسلاف کی پامال راہوں اور آباؤ اجداد سے وراثتاً منتقل ہو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کوئی سوال سامنے آئے اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس باب میں فلاں حضرت نے یہ کہا ہے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی

قسم کی فکری کاوش درکار ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ حوالے یاد ہوں۔ یعنی جو سب سے بڑا (Cataloguer) ہو وہ سب سے بڑا عالم ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف حافظہ (Memory) کی ضرورت ہوتی ہے فکر (Intellect) کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے، روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے۔ عوام جس راستے پر چل رہے ہوں، آپ اس کی تائید کرتے جایئے پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رہے ہو اور ان کی ''بکری'' پر اس قدر متعجب ہوتے ہو تو ان کی تجارت کا راز۔۔۔ (Trade Secret) ہی یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں، وہ راستہ جنت میں لے جانے کا ہے۔

تجارت کا راز:

تجارت کا دوسرا راز یہ ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں کتنی ہی سر پھٹول کیوں نہ کریں، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے، سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنالیں۔ یعنی ان کی باہمد گر پیوستگی کا موجب صرف اس پیشہ کا مفاد ہوگا۔ یہ جو مختلف پیشوں۔۔۔ (Professions) والوں کی (Unions) دیکھتے ہو تو ان کی وجہ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور بس۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہمد گر مربوط رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا جب انہوں نے بت خانہ کے منتریوں (مذہبی پیشواؤں) سے کہا تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے ان کا مذہبی جتھہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس جتھہ میں کمزوری آجائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی بسر ہو رہی ہے، وہ باقی نہیں رہے گی۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (29:25) ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی رو سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے۔ اس سے تمہارا جتھہ بنا ہوا ہے اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں۔

عوام کو بھڑکا کر:

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوا، انہوں نے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا! یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کر کے رکھے گا۔ اُٹھو! قَالُوا اقْتُلُوْهُ (29:24) اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوْهُ ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (21:68) اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ (20:47) تم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز آجاؤ

اورانہیں ہمارے ساتھ جانے دوتا کہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کہ فرعون اس موضوع پر بات کرتا اس نے بات کا رخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔ فرعون کے دربار میں اس کے امراء وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اوران کے آباؤ اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کی بات تو بعد میں ہوگی پہلے یہ بتاؤ کہ: فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (20:51) جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں (یعنی ان امراء ووزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیش نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے مدمقابل کون ہے؟ اس کے مدمقابل تھا خدا کا رسول جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا کہ: عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى ۝ (20:52) ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافاتِ عمل کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے نہ غلطی کرتا ہے۔ ان کا معاملہ اس کے ساتھ ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں؟

دورِ حاضر میں:

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ: اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ پکڑ لو۔ جانے نہ دو۔ یہ فتنہ ہے اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے بصری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش بغیر محنت کئے حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے۔ اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اس سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور پر سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا اثر بہت دوررس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے تو اس کے بعد وہ عضو ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، گول ڈاک خانہ کے پاس ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا۔ اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ دن بھر وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ جب کوئی اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے غور وفکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور وفکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں میں ارباب عقل وفکر کا اس قدر قحط کیوں ہے۔ ان کے ہاں صاحبان عقل وبصیرت کیوں پیدا نہیں ہوتے جب کہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم

نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے، اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے اٹل قانون کے مطابق ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔

تقلید کا طوق:

اس گول ڈاکخانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔ تقلید کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ (36:8) ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے سر اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن ٹھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝ (36:9) ان کے سامنے بھی روک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وَسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (36:10) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے۔ یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِیْمِ ۝ (37:68) ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی اس لئے کہ: اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّیْنَ ۝ (37:69) انہوں نے جس گمراہ کن روش پر اپنے باپ دادا کو پایا اسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں اس لئے ان کے نزدیک ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔ ان سے جب سنئے یہ اپنے ماضی کے قصے دہراتے رہیں گے۔ اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماضی کو ست جگ (حق و صداقت کا زمانہ) اور مستقبل کو کلجگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔ تمہیں یاد ہے شملہ میں وہ لڑکا، فتو گوجر، جب تمہیں راستہ دکھانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا تو تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔ لالٹین کے پیچھے رکھنے سے، طے کردہ راستہ تو روشن ہو جاتا تھا لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک۔ تر ہو جاتا تھا۔ یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک گزرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے الٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آنکھیں سامنے کی طرف ہونے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں۔ یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ (33:66) اس کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کی تصریح اگلی آیت میں کر دی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ: اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝ (33:67) بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے جو خدا نے متعین کی تھی۔

حیوانی سطح کی زندگی:

ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں یوں گمراہ کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جو لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ''بھیڑ چال'' کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ بھیڑوں کا ریوڑ ہوتی ہے۔ دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو

بیان کرتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ (7:179) انسان شہری ہوں یا دیہاتی، ان کی اکثریت جہنم ہی کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ (7:179) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ (7:179) ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (7:179) ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (7:179) یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (7:179) یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل وفکر سے کام لیا جائے۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ بھیڑ چال، انسانیت کا خاصہ نہیں، حیوانی روش ہے۔ اسی حقیقت کو سورہ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ:

قرآن کی نہیں، اسلاف کی اتباع:

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مذہب کا اتباع کرتے رہیں گے۔ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (2:170) جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ خواہ تمہارے آباؤ اجداد کچھ بھی عقل وشعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں تم اس پر بھی ان ہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ اس کے بعد ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ (7:171) یہ لوگ جو سیدھے رستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں ان کی مثال یوں سمجھو کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا معنی ومطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دہراتا ہے اور بھیڑ بکریاں جو ان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے اِدھر اُدھر مڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباء کی تقلید کرنے والوں کی ہے۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ (2:171) بہرے، گونگے، اندھے، عقل وخرد سے کام نہ لینے والے جانور، انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم! کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (2:170) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) (قرآن) کا اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی مذہب ومسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں یعنی قرآن مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (2:170) کے اتباع اور مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (7:170)۔ (اسلاف کے مسلک) کے اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ چیز جس طرح نزول قرآن کے زمانے میں حقیقت تھی اسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق میں الجھے رہتے ہیں لیکن جونہی کوئی

شخص انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اسے ''دین'' کے لئے عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ مختلف فرقے، ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں، ان میں سے کوئی بھی مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط (7:170) کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کی ذہنیت:

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب ان کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے۔ وہ عیسائیوں کے متعلق۔ فلاں آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ فلاں منافقین مدینہ کے متعلق۔ گویا یہ تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں۔ ہمارا ان سے (اور ان کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں۔ یہی کچھ ہم ان آیات کے متعلق کہہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے منع فرمایا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کے متعلق ہیں۔ ہمارے متعلق نہیں۔ حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف سے متعلق قرار دیں۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے بزرگوں کی سوءادبی ہوتی ہے۔ جہاں تک دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ہے آپ سوچئے کہ ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح ان لوگوں کے دل کو بھی ٹھیس لگتی ہے جن کے متعلق آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آیات آئی ہیں۔ (یعنی غیر مسلموں کے متعلق) اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ٹھیس کی ذرا بھی پروانہ کرنا یہ تو کچھ اچھی ذہنیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلے میں ''اپنے اور پرائے'' میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت ''اپنا یا پرایا'' اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ان کا انجام یہ ہوگا اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ہر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ہے کہ وہ اسی اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے برا منا لیتا ہے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ہے تو وہ بُرا منایا کرے۔ قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کچھ نہیں۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ہے تو تم اسے چھوڑ دو اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اسلاف میں فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج (2:141) یہ (تمہارے

اسلاف) گذر چکے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ (2:141) جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ (2:141)

تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟ اس لئے اس میں تمہارے بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

لیکن اسلاف پرستی کا بُرا ہو کہ وہ انسان کو صداقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتی!

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کر لو کہ ان کی ہر بات غلط تھی وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو (یا جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں) قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح سمجھو۔ جو ان کے مطابق نہ ہوں، انہیں غلط سمجھو۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ (2:120) ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔

قرآن کا فائدہ؟:

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ ان کے سامنے بھی تو قرآن تھا اور وہ ہم سے بہترین قرآن سمجھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے) لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ اس دلیل کو سلیم! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری ہوں گے، نہ کہ قرآن۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں۔ اور قرآن نہ ہو تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے۔ عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ زبان ان کی اپنی ہوتی ہے مطالب و معانی سب وہی ہوتے ہی جو اسلاف نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہو تو اس کی اس کوشش کو مردود، اور اسے دین کے لیے فتنہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو حرفاً حرفاً سلف کے مسلک کے مطابق ہو۔

تدبر و تفکر:

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبر و فکر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے اس کے بعد یہ منسوخ سمجھا جائے۔ لہٰذا تدبر فی القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسے ہمارے اسلاف کے لئے تھا۔ لیکن ان حضرات کے تصور کے مطابق ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے۔ تدبر جو کچھ کیا جانا تھا

اسلاف نے کرلیا۔ لیکن یاد رکھو! نہ تو ہم خدا کے ہاں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم نے فلاں مسلک کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ ہمارے اسلاف کا مسلک تھا اور نہ ہی ہمارے اسلاف ہماری اس روش کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے۔ بلکہ وہ ہم سے بیزاری کا اعلان کردیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ (2:166) جب وہ لوگ جنہیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنالیا تھا، اپنے متبعین سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور یہ متبعین عذابِ خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلید اسلاف) وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے نظر آئیں گے تو اس وقت انہیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار کہیں پیچھے مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کریں جس طرح انہوں نے ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ (2:167) لیکن انہیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آسکتا۔ زندگی ''آواگون'' کے چکر (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہور نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا کہ ہمارے اعمال واپس کردیئے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کرلیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہوگی۔

اسلاف بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے

بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے رہو۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ اطاعت صرف احکام خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ ودانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگاتے ہیں تاکہ اس سے ان کی ''دکانداری'' بڑھے تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اس منظر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورہ ابراہیم میں ہے کہ: فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ (14:21) یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اتباع کیا کرتے تھے تو کیا تم اس عذابِ خداوندی کو جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے، ہم سے دور نہیں کرو گے؟ اس کے جواب میں وہ پیشوایانِ مذہب اور ہادیانِ سیاست، ان سے کہیں گے کہ: لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ (14:21) اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو ہم تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے، اس وقت تو جس طرح بے بس اور لاچار تم ہو ہم بھی ویسے ہی ہیں: سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾ (14:21) اب چیخنے چلانے سے کیا حاصل ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس لئے اب اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

جہنم میں مکالمہ

سورۂ سباء میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے: یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ

اسۡتَكۡبَرُوۡا لَوۡلَاۤ اَنۡتُمۡ لَكُنَّا مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳۱﴾ (34:31) یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا۔ قَالَ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡۤا اَنَحۡنُ صَدَدۡنٰكُمۡ عَنِ الۡهُدٰى بَعۡدَ اِذۡ جَآءَكُمۡ بَلۡ كُنۡتُمۡ مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۲﴾ (34:32) وہ پیشوا اور سردار، ان سے کہیں گے کہ تم ہمیں موردِ الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو۔ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ کیا ہم نے تمہیں اس کے اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ تم نے خود ہی اس کے اتباع کی بجائے ہمارے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا دیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہیں گے کہ: بَلۡ مَكۡرُ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ اِذۡ تَاۡمُرُوۡنَنَاۤ اَنۡ نَّكۡفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجۡعَلَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ (34:33) یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے کہ جن سے ہم قانونِ خداوندی سے انکار کر کے تمہیں خدا کا ہمسر بنا لیں۔ ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے تمہارا اتباع اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اس کے لئے جو طریق تم نے اختیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

سلیم! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے بیان حقیقت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے کہ: رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا ﴿۶۷﴾ (33:67) اے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے۔ ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دور رکھ۔ بہت دور۔

سورہ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعد میں آنے والی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہے گی کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اس لئے انہیں دگنا عذاب ملنا چاہئے۔ اس کا انہیں جواب ملے گا کہ لِكُلٍّ ضِعۡفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملے گا۔ پہلی نسل کو اس لئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنے والوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے اور تمہیں اس لئے دگنا عذاب دیا جائے گا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے بُری مثال قائم کر گئے۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنے والوں کے اسلاف تھے۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ: فَمَا كَانَ لَكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۳۹﴾ (7:39) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دہرا عذاب اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو! ہم غلط روش پر چلے تھے تو تم نے کونسا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا؟ اس لئے تم اپنے کئے کا پھل پاؤ۔ ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے۔

تقلید کا چکر:

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ جو قومیں اپنی عقل و فکر

سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں۔ ان پر غلط روی کا ایک ایسا چکر محیط ہو جاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔ ہر نسل، اپنے پیشواؤں کے نقوش قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے۔ اور اپنے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تا کہ وہ بھی ان کی طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں۔ دو چار نسلوں کے بعد یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے؟ اقوام سابقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آ جاتا تھا جو انہیں اس چکر۔۔۔ سے نکال کر سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ نبی کی ضرورت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سابقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے۔

نجات کا راستہ:

لیکن رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی (نبی) نہیں آئے گا۔ حضور ﷺ کی اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس لئے انہیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں، خدا کی کتاب اس کے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہو جاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہئے تا کہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہئے تا کہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی آنے والوں کے لئے سند میں اضافہ کر دیتی ہے۔۔ تم نے (Steel Works) کے کارخانے میں دیکھا تھا جب انجن کو شروع میں (Start) کرتے تھے تو اس کے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا (Fly Wheel) خود اپنے زورِ دروں (Momentum) سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا۔ یہی کیفیت قوموں کی نفسیات کی ہے۔ شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں گذشتہ نسل کی روش، آنے والی نسل کے لئے (Momentum) کا کام دیتی ہے۔ اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کسی دور کے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔

سخت مخالفت:

اگر اس کام کو کسی دور نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی دور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے) کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس طبقہ میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی موجودہ روش کو، جسے انہوں نے اسلاف کے اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے،

دیانت داری سے صحیح روش سمجھتے ہیں، اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی ادھر اُدھر ہٹنا ان کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جہنم کی طرف چلے جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے۔ لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت (Popularity) حاصل ہوتی ہے اور دکانداری کو فروغ۔ اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے۔ وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرنے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔

لہٰذا اس آواز کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیت عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد پھر مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوہشوں کے علی الرغم، آنکھیں بند کر کے چلنے والوں سے حضور رسالت مآب ﷺ کے اتباع میں للکار کر کہیں کہ: اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (34:46) تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے دو دو، ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو!

اگر اس انبوہ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھ لو کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اس لئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے، کسی پکارنے والے کی آواز پر رک جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار ہے۔ (یا اسے کم از کم اپنی موجودہ روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رکتا ہی کیوں) اور اس کے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آ جائے۔ اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کون سا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی اکرم ﷺ گامزن تھے۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکوئے زبندِ پاستاں آزاد رفتے!
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے
(اقبالؒ)

(ترجمہ: کیا ہی اچھا ہوتا اگر نیک انسان اسلاف کی تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو کر چلتے۔ تقلید اگر کوئی اچھی چیز ہوتی تو پھر پیمبر بھی اپنے بزرگوں کے راستے کو اپناتے۔)

والسلام

پرویزؔ

(مطبوعہ طلوعِ اسلام فروری 1982ء)

ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دِیا جلائے رکھنا ہے

ماں دنیا کی عظیم ہستی ہے جس کی محبت وشفقت سے یہ دنیا پرنور ہے بے لوث خدمت کا بحر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں ہے وہ موج ہے جس میں طغیانی نہیں وہ سکوت ہے جس کے بعد پریشانی نہیں ہے۔ جذبۂ محبت جس کو مامتا بھی کہا جاتا ہے ہر ذی روح کو عطا ہوئی ہے لہٰذا اس کا چرند، پرند، حتیٰ کہ درندوں اور موذی جانوروں تک میں اپنی اولاد سے بے غرض و بے لوث اظہار محبت بَرملا نظر آتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ کیا دنیا کا کام اس شدید جذبے کے بغیر ناممکن تھا؟ یقیناً اللہ تعالیٰ نے کائنات بے وجہ، بلاضرورت، صرف کھیل کود کے لئے نہیں پیدا کی، اس کا ایک خاص مقصد ہے اور ایک اہم اسکیم ہے۔ جو اس کارخانے کو عدم سے وجود میں لانے کے بعد سے آج تک اربوں سالوں سے سرگرم عمل ہے۔ اس کی انتہا کو قیامت یا روز آخر سے قرآن تعبیر کرتا ہے۔ جس میں پھر سے جی اٹھنے کا عمل اور حساب وکتاب شامل ہیں۔

فی الوقت ہم پندرھویں صدی کی جس دہائی سے گزر رہے ہیں اُس لمحے یا اُس پل تک انسانوں کی ترقی وعظمت کی کافی داستانیں صفحہ قرطاس پر پھیل چکی ہیں ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات سے انسانی ذہن کی ''انشاء پردازیاں'' دیکھ سکتے ہیں۔ ایٹم کا سینہ چیر کے اس سے توانائی کے ذخائر حاصل کر کے زندگی کی رفتار کو کئی ہزار میل فی گھنٹہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ تو دوسری جانب وہ کئی بے گناہ ومعصوم زندگیاں آن کی آن میں نیست ونابود بھی کر سکتا ہے۔ عروج وزوال کی اس داستان میں وہ بنیادی ضرورت جس کو زندگی ترستی ہے وہ جذبۂ مامتا آج بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کل تھا۔ کیا ہم نے ماؤں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی حفاظت کے لیے بھی کبھی سوچا ہے؟

میڈیکل سائنس نے بھی اپنے عروج کا زمانہ دیکھنا شروع کر دیا جب دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک نے سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور کیا کہ زچگی کے دوران ماؤں کی شرح اموات زیادہ ہونے کی وجہ سے بچے دنیا میں اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں ان کی پرورش (جس کے لئے مخصوص قسم کے ''غیر محسوس تار'' اس بچے کے درمیان ہوتے ہیں) وہ نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہے لہٰذا 1952ء میں پہلی دفعہ انگلینڈ اور wales ویلز میں ایک انکوائری شروع کی جس کے تحت اس شفیق ہستی کو بچانے کے لئے تدابیر کی جاسکیں۔ وہ رپورٹ ہر تین سال کے وقفہ سے جاری کی جاتی ہے ان کے ساتھ ہی دوسرے ممالک آئرلینڈ نے 1956ء اور سکاٹ لینڈ نے 1965ء میں یہ انکوائری شروع کیں۔ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد اس دہائی میں پہنچ کر انہوں نے اپنے شعبہ صحت میں جو ترقی کی منازل طے کیں اس کے تحت علاج ومعالجہ کی سہولتیں بلاتخصیص

نسل، قومیت وزبان رائج کردیں۔

ترقی یافتہ ممالک جن مشکلات پر قابو پانے کے بعد آج جس منزل کی طرف رواں دواں ہیں ہم اس قافلے کی اڑتی ہوئی گرد بھی نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ہم سے کوسوں میل آگے نکل چکے ہیں اور خدائی پروگرام سے اپنا نصب العین منطبق کرنے کے بعد عملی میدان میں صحیح معنوں میں نظام قدرت کے مددگار اور حامی ہیں۔ گو کہ ان میں کوئی مسلمان نہ ہو لیکن اس میدان میں، جزواً وہ سب اسلام کے ہی پیروکار ہیں۔

اسلام الدین ہے کوئی مذہب نہیں جس میں انفرادی ذات، کی ترقی ہی منزل مقصود ہو یہاں کوئی موج بیرون دریا ہو ہی نہیں سکتی۔ شخصیت پرستی کی سختی سے ممانعت کرتا ہے اور یوں ذات پات، رنگ ونسل، حیثیت ومرتبہ، جاہ وجلال، اقتدار، لسانیت کے بتوں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے کہ اس میں نہ کوئی بندہ ہوتا ہے اور نہ بندہ نواز!!

ناظرین ہم جس موضوع پر آج قلم اٹھا رہے ہیں وہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ شعبہ تعلیم ہو یا صحت دونوں سے قوموں کی زندگی کی ڈور بندھی ہے۔ صرف تعلیم یافتہ قوم ہی باوقار مستقبل کا خواب دیکھ سکتی ہے پاکستان میں تعلیم بدقسمتی سے صرف 40 فیصد اور صحت کا اندازہ وشمار ناممکن ہے کیونکہ ہمارے یہاں نظام حکومت میں اس شعبے کا بجٹ ہی نپا تلا ہوتا ہے۔ اس قسم کے ادارے جو کہ ملک بھر سے مسائل کی انکوائری کر کے رپورٹ بنائیں اور حتمی شکل دینے کے لئے حکومت وقت کے ساتھ مل کر ان مسائل کو حل کریں ناممکنات میں سے ہے۔ جس جنتی معاشرے کے قیام کی بات قرآن کرتا ہے وہ تو اسی دنیا میں رہتے ہوئے نظام حیات ایسا عطا کرتا ہے جس کے تحت فلاحی مملکت قائم ہوسکتی ہے جس میں ہر انسان آسانی سے اپنے لئے متاع حیات حاصل کرسکتا ہے۔ قرآن کے تحت عمل میں لائی جانے والی مملکت کا سربراہ کوئی بادشاہ نہیں ہوسکتا وہ خادمِ انسانیت کہلاتا ہے۔ حکومت صرف قانون خداوندی کی ہوتی ہے اس پروگرام کو عملی جامہ جماعت المومنین پہناتی ہے۔ اس نظام کے اثرات تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں جا بہ جا!! چشم بینا ودل بسمل چاہئے ان سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے۔

پاکستان میں ماؤں اور بچوں کی شرح اموات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ حال ہی میں عالمی ادارہ صحت نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس کے تحت تقریباً 600,000 مائیں۔ ہر سال دنیا بھر میں دوران زچگی اپنی زندگیوں سے محروم ہوجاتی ہیں۔ جس میں سے زیادہ تعداد غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ چند مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے ادارہ صحت اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ان ممالک میں تعلیم کی کمی، صحت کی مناسب سہولیات کے بروقت موجود نہ ہونے یا ملکی حالات، سڑکیں، ذرائع نقل وحرکت کے مناسب وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے، مشکلات ہیں۔ جن غریب ممالک کا تذکرہ وہ افسوس ناک طریقے سے کرتے ہیں اکثر ان میں وہ مسلم ممالک ہیں جن کو قدرت نے بیش بہا ارضی خزائن سے نواز رکھا ہے۔ جن کے مسائل، وسائل کو بروئے کار لا کر اپنی مدد آپ نہ کرنے کی وجہ سے خوفناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔ پاکستان کی معیشت اور ترقی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وسائل اور ناقابل شکست مسائل کا کتنا عظیم دنگل برپا ہے۔ جس عفریت کے قدموں تلے انسانیت سسک رہی ہے اور جو ہر آن اس کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے۔

پاکستان جو ایک نظریاتی مملکت ہے جس کے قیام کی خاص وجہ جس سے کچھ متحارب قوتیں متفق جب بھی نہیں ہوسکیں آج

بھی نہیں ہے مگر ان کی بنیادوں پر کاری ضرب لگانے میں مصروف عمل ہیں۔ نتیجتاً پندرہ کروڑ عوام کا اژدھام ہر سمت بکھرا ہوا ہے۔ جس قوم کا نصب العین ہی متفق علیہ نہ ہو وہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہو سکتی ہے۔ روز و شب بدلتی صورت حال سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں۔ قارئین کرام! کیا ایک لمحے کے لئے بھی ہم اپنی کوتاہ بینی سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں؟ شاید نہیں! ہم میں سے ہر شخص مصر ہے کہ اس میں میرا کیا قصور!!

اگر کسی گاؤں کے کچے مکان میں آٹھ بچوں کی ماں یا شہر کی کسی بستی کے کسی گھر میں کوئی ماں موت کا شکار ہوتی ہے تو ایک عام جملہ ہر شخص کی زبان پر آتا ہے۔ اللہ کی مرضی' اس کی موت ہی یوں لکھی تھی۔ کیا کر سکتے ہیں۔ علاج تو بہت کیا مگر موت تو آنی ہی ہے لہٰذا اسے کوئی روک تو نہیں سکتا یہ سوچ کس قسم کے رویے کی غماز ہے۔ یعنی ہم کیا کر سکتے ہیں خدا کی مرضی! بے بسی و بے یار و مددگاری' تنہائی و بے کسی بے بسی وغیرہ وغیرہ کے غیر انسانی جذبات نظر آتے ہیں۔

میرا واسطہ زچہ و بچہ کے امراض اور ان کے علاج سے ہے حال ہی میں ایک مولوی صاحب کی بیگم صاحبہ چودھویں بچے کے ضائع ہونے کی وجہ سے میری ایمرجنسی میں آئی تو ڈاکٹرز نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کی صحت اور باقی بچوں کے لئے ضروری ہے کہ آپ بچے بند کروالیں یا پھر وقفہ ہی کریں۔ ان کا مدعا جاننے کے بعد کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اُسے مشورہ ہی دے سکتا۔ مریضہ کا مؤقف تھا کہ بچے اللہ کی نعمت ہیں وہ جب دے رہا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ منع کریں اس میں تو اگر عورت کو موت بھی آجائے تو وہ شہید کی موت ہے۔ سیدھی جنت میں چلی جائے گی!!!

یہ وہ لوگ ہیں جو سینے پر بم باندھ کر انسانیت کا قتل عام کرتے ہوئے جنت میں چلے جاتے ہیں ان کا بر ین کس قدر واش کر دیا جاتا ہے یہ تو کرنے والوں کا کمال ہے ماننا پڑے گا۔ تاج محل کی دلکشی و رعنائی کے چرچے ایک صدی گزرنے کے بعد آج بھی سنائی دیتے ہیں جس ممتاز محل کو اُس بہترین آرٹ کے نمونے کی نذر کر دیا گیا اس کی موت پر کوئی ماتم کرنے والا نہیں تو سبق سیکھنے والا کیسے پیدا ہو سکتا ہے!!

اپنے اٹھارہویں بچے کی پیدائش پر ممتاز محل خون نہ رکنے کی وجہ سے اس دار فانی سے رخصت ہوئیں تو بادشاہ سلامت نے ملکہ عالیہ کے سوگ میں دن رات ایک کر کے دنیا بھر سے بہترین آرٹسٹ' کاریگر' ڈزائینر' انجینئر مدعو کئے اور اپنے ذوق کی تسکین کے لئے بیوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تاج محل تعمیر کر دیا جو کہ ایک شاہکار ہے۔ انہیں دنوں میں سویڈن کے فرمانروا کی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہو گیا۔ اس نے ملک بھر سے ڈاکٹرز ہیلتھ کیئر سسٹم بہتر کرنے کے لئے کمیشن بنایا جو کہ ماؤں کی زچگی کے دوران یا اس سے متعلقہ بیماریوں کی وجہ سے موت کا شکار ہونے والی خواتین کا اندازہ لگائے جو کہ 900/100,000 زچگیوں میں تھیں۔ یہ رپورٹ 1751ء میں پہلی مرتبہ چھپی۔ یورپین دنیا میں بھی سب سے پہلے سویڈن نے مردم شماری اموات' شادیوں اور زچگیوں کے حساب کتاب کے لئے رجسٹر بنائے اور اعداد و شمار کر کے اپنی کمزوریوں کو سمجھا اور ان کے تدارک کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے گئے جو کہ دو صدیوں پر محیط ہیں۔ ان اقدامات میں سب سے پہلے بہتر' ٹرینڈ مڈوائفری سسٹم شہروں' دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں میں متعین کیا۔ اس سسٹم میں مڈوائف' ڈاکٹر اور ہسپتال شانہ بہ شانہ کام کر رہے تھے۔ انیسویں صدی تک آتے آتے یہ شرح اموات 230/100,000 رپورٹ کی گئی جو کہ 1751ء سے

1900ء تک محیط تھی۔ آج بیسویں صدی میں سویڈن کی ماؤں کی شرح اموات 3/100,000 ہے جو کہ بہترین، جدید ترین، میٹرنٹی سروسز کو ظاہر کرتی ہیں۔ بلا امتیاز رنگ و نسل، امیر و غریب، شہر و دیہی علاقہ جات تمام خواتین کو یکساں طور پر ہیلتھ سروسز مہیا کرنا یقیناً قرآنی نظام ربوبیت کی ایک خصوصیت ہے۔ چاہے وہ عقیدہ کے اعتبار سے کسی بھی مقام پر ہوں مگر عملی میدان میں وہ رب کائنات کے بنائے ہوئے اصولوں کے تابع ہیں۔ انسانیت کی منفعت کے لئے کوشاں برصغیر میں ماؤں کی شرح اموات آج بھی 400,450/100,000 زچگیوں میں ہے۔ یہ اعداد و شمار ہمارے ناقص ہیلتھ کیئر سسٹم کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں لوگوں میں لاعلمی اور لاپروائی کا ایک عنصر عام ہے وہاں ہیلتھ کیئر سسٹم میں بھی ناہمواریاں و ناقص انتظامات ایک اہم وجہ ہیں۔

انسانی حقوق کی علمبردار کافی تنظیمیں ماؤں کی صحت کے لئے فکرمند رہتی ہیں لیکن کسی سسٹم کے تحت ایک منظم طریقے سے حکومتی سطح پر زچہ و بچہ کی صحت کے لئے انتظام اور کوششوں میں فقدان ہے۔ جس نظام میں انسانی زندگی کی کوئی وقعت باقی نہ رہے اس نظام کے تحت بننے والے معاشرے میں لوگ جس زندگی کو گزارتے ہیں اس کو قرآن جحیم کہتا ہے۔ لفظ جحیم، جہنم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے لفظی معنی تو رکے ہوئے ہونا ہے۔ جہاں ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں۔ انسانوں کی آزادی افکار چھین لی جائے۔ اس بے بس معاشرے کی زندگی ہی جہنمی زندگی ہے۔

دیکھئے! قرآن جس نظام کے تحت معاشرے کی تعمیر کرتا ہے وہاں ہر انسان کو اپنی پوری قوت، جوش و جذبے سے آگے بڑھنا ہے اور آسمانوں کی طرف اٹھنا بھی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ ہی جنتی زندگی کا خاصہ ہے جو چاہیں گے ملے گا۔ جتنا مانگو گے ملے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ نعمتیں جن کا ذکر قرآن کرتا ہے وہ اُخروی دنیا کے لئے ہی نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں بھی انسانوں کی زندگیوں میں مسلسل ترقی تعمیر اور آگے بڑھتے چلے جانے کی جستجو اور نئی راہوں کی تلاش ہی تو جنت ہے!!

14 مئی کو ہم نے ماؤں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ دن منایا یہ سوچ کر کہ شاید ہماری ماؤں کے درد کا بھی کوئی درماں ہوا کرے۔ دنیا میں بے لوث پیار کرنے والی اس ہستی کی قدر و قیمت کا اندازہ تو وہی لگا سکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہو جائے یا جس نے کبھی اس لمحہ کو پایا ہی نہ ہو۔ کتنے ہی نوزائیدہ بچے ہیں جن کی زندگیوں میں یہ بہار کبھی نہیں آئی جو اس وجود کی کمی کو ساری عمر محسوس کرتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی مکمل اور بے باک شخصیت کے حامل نہیں ہوتے۔ اے کاش کہ اہل زمانہ غور کریں۔ کبھی ان قیمتی جانوں کے نذرانوں پر تفکر کریں اور مثبت لائحہ عمل پہ کام کریں اس کام میں صرف حکومت ہی نہیں بلکہ ہر شخص جو کسی بھی حوالے سے کسی کے کام آسکے وہ اگر اپنی ذمہ داری کو نبھا دے تو یہ اعداد و شمار کم ہو سکتے ہیں۔ بروقت علاج کی سہولت، صحت و صفائی، اولاد میں مناسب وقفہ، غذا، صاف پانی، ماہرین امراض کی بروقت موجودگی، ادویات، خون کا انتظام، لیبارٹری سسٹم حتیٰ کہ ایمبولینس بمع ڈرائیور کی بروقت موجودگی بے انتہا ضروری ہے۔

شکوۂ ظلمت شبِ سے تو کہیں بہتر تھا اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

قرآن پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 2:

رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کا مسئلہ بھی یہاں سے ہی لے لیتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے دور کے حالات ہنگامی تھے۔ حضور ﷺ نے 82 دفاعی لڑائیاں لڑیں تھیں کیونکہ حالات سخت ہنگامی تھے۔ اس لئے حضور ﷺ نے ایک سے زیادہ شادی کی لیکن بیک وقت چار سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھیں جہاں تک حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت عمر کا مسئلہ ہے اس کے متعلق کافی لٹریچر طبع ہو چکا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کی عمر نکاح کے وقت تقریباً ساڑھے 17 سال تھی اور رخصتی کے وقت ان کی عمر تقریباً ساڑھے 21 سال تھی۔ سرگودھا سے مولوی الف اللہ پانی پت جو بھائی ولاء اللہ کے بڑے بھائی تھے اور حکیم نیاز احمد صاحب نے حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت عمر کے متعلق بڑی تحقیقی کتاب طبع کرائی ہے اس سے پیشتر طلوع اسلام میں اس موضوع پر کافی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ طاہرہ کے خطوط کے آخر میں بھی اس موضوع پر بہت مواد ہے جن صاحب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ ادارہ طلوع اسلام سے رجوع کریں یہ سارا لٹریچر وہاں سے مل جائے گا ورنہ یہ لٹریچر ہماری ویب سائٹ www.azharabbas.com پر ملاحظہ فرمائیں ہم نے یہ لٹریچر اپنی ویب سائیٹ پر ڈال دیا ہے ہم اس مسئلہ میں الجھے تو مضمون طویل ہو جائے گا اور تاریخی کتابوں سے لمبے لمبے اقتباسات دینے ہوں گے۔

طلاق کی اجازت صرف قرآن نے دی ہے اور کسی مذہب یا تمدن میں عورتوں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ عورتوں کے لئے یہ بڑا استحقاق ہے کہ اگر ان کی اپنے خاوند سے نہ بنے تو ساری عمر پریشان رہنے کے بجائے اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے۔ قرآن کی رو سے نکاح اور طلاق کا مسئلہ انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ریاست کے ذریعے ہوتے ہیں۔ جب قرآن نے جمع کا صیغہ وَاِنْ خِفْتُمْ (4:3) استعمال کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (65:1) کیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ریاست کا کام ہے اس جگہ رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت صدر مملکت خطاب ہے۔ ویسے ہی رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں سے کسی کو طلاق نہیں ہوئی قرآن نے جو طلاق کا حق عورتوں کو دیا ہے اس کو ضرور Appreciate کرنا چاہیئے۔ اب موجودہ حکومتیں اپنی اپنی حکومتوں میں طلاق کا قانون Adopt کر رہی ہیں۔ طلاق دینے کا حق مردوں اور عورتوں دونوں کو قرآن نے دیا ہے۔

(3) عزیز محترم نے عورتوں کے پردہ کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے قرآن میں عورتوں کے پردہ کے سلسلہ میں کوئی حکم

نہیں ہے سورہ نور میں ایک مقام غضِ بصر کا حکم ہے (24:30) کہ مومنین اپنی آنکھیں نیچے رکھیں اس میں مردوں کو پہلے یہ حکم ہے عورتوں کو غضِ بصر کا حکم اس کے بعد ہے۔ ان آیات سے شریعت میں پردہ آیا ہے لیکن قرآن نے پردہ کا حکم کہیں نہیں دیا یہ ایک معاشرتی عمل ہے جس کا دل چاہے کرے اور جس کا دل نہ چاہے نہ کرے۔

(4) ہمارے قابل احترام عزیز نے تعدد ازواج کے سلسلے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اگر مردوں کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ہونی چاہئے تھی اصل یہ ہے کہ قرآن کریم خاندان یا کنبہ کی اکائی پر بڑا اصرار کرتا ہے کیونکہ کنبہ وہ اکائی ہوتا ہے جو انسانیت کو آگے لے کر چلتا ہے ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے اگر وہ پٹواری ہے تو اس کا بیٹا تحصیل دار بنے اور اگر وہ B.A ہے تو اس کا بیٹا M.A کرے بچوں کی تعلیم پر ہر ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر کھل کر خرچ کرتے ہیں لیکن یہ ہی لوگ اپنے حقیقی بھانجے بھتیجے کے لیے کچھ بھی خرچ کرنے کو آمادہ نہیں ہونگے تو ان قرآن کریم ولدیت کا رشتہ رکھنا ضروری سمجھتا ہے اسی لیے قرآن نے اِستبنیٰ کو حرام قرار دیا ہے کئی شوہر رکھنے سے ولدیت مشکوک ہوجاتی ہے جس سے معاشرے میں بہت مسائل پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔

(5) عورتوں کے سلسلہ میں انہوں نے یہ اعتراض کیا ہے قرآن کریم عورتوں کا مقام مردوں سے کم رکھتا ہے اگر خدا عادل ہے تو اس نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت کیوں دی ہے انہوں نے جو آیت نقل کی ہے وہ طویل ہے انہوں نے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) پر اعتراض کیا ہے انہوں نے اسی کا ترجمہ Men have authority over Women تحریر کیا ہے۔ اس آیت کا صحیح مفہوم تحریر کرنے سے پیشتر ہم ایک اصولی بات جو قرآن فہمی کے سلسلہ میں نہایت اہم ہے وہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں یہ نکتہ بہت غور سے دیکھنے کا ہے اگرچہ ذرا طویل ہے۔

بنوامیہ کا دور 40 ہجری سے شروع ہوکر 132 ہجری پر ختم ہوا۔ بنوامیہ کا یہ دور 92 سال رہا اس کے بعد بنوعباس کا دور شروع ہوا اور یہ تقریباً 6 سو سال جاری رہا۔ بنوعباس اگرچہ خود عرب تھے لیکن اس عباسی دور کو آپ ایرانی دور ہی شمار کریں کیونکہ مسلمانوں نے ایران کو فتح نہیں کیا بلکہ حقیقت میں ایران نے اسلام کو فتح کرلیا تھا۔ بنوعباس کے تمام خلفاء کی مائیں ایرانی تھیں۔ اور ایرانیوں کا اثر حضرت علی مرتضیٰ کے دور سے شروع ہوگیا تھا۔ تین خلافتیں مدینہ میں رہیں حضرت علی المرتضیٰ نے اپنا دارالخلافہ مدینہ سے بدل کر کوفہ منتقل کردیا تھا جہاں کسی زمانہ میں ایران کا Governor ہوتا تھا۔ ایرانیوں کے دل میں جو عربوں سے نفرت تھی وہ شہنامہ فردوسی کے اشعار سے خوب واضح ہوتی ہے ہم اس دور کے ایرانیوں کا ذکر کررہے ہیں موجودہ دور کے ایرانیوں سے ہمارا خطاب نہیں۔ بنوعباس خود بھی ایک مخصوص ایرانی ذہنیت کے حامل تھے بنوامیہ کے دور میں کوئی کتاب نہیں تھی اس دور میں صرف قرآن تھا۔ بنوعباس کے دور میں تفاسیر، احادیث، فقہ شریعت یہ سب مدون ہوئے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جب مفسرین نے تفاسیر تحریر کرنی شروع کیں تو انہوں نے تفسیر کرنے کے کوئی اصول ہی مقرر نہیں کئے اور تفاسیر تحریر کرنی شروع کردیں اور قرآن کے دیے ہوئے اصولِ تفسیر انہوں نے بالکل نظر انداز کردئے۔ یہ تفسیر کرنے والے لوگ ایرانی اور بیشتر شیعہ تھے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے مفسر امام طبری ہیں۔ یہ طبرستان کے رہنے

والے تھے اوران پر شیعیت کا اتہام تھا۔تاریخ کے مطابق وہ جب فوت ہوئے تو لوگوں نے ان کے جنازے پر خشت باری کی یہاں تک کہ ان کو ان کے گھر کے اندر ہی دفن کرنا پڑا۔ ہماری ساری تفسیریں تفسیر طبری کا چربہ ہیں۔ ہمارے یہاں جو تفاسیر تحریر کی گئی ہیں وہ احادیث کے زیر اثر تحریر کی گئی ہیں اور احادیث کی کتابیں سب ایرانیوں کی تحریر کردہ ہیں۔

یہ مفسرین آیت قرآن کی لیتے ہیں پھر اس کا شانِ نزول حدیثوں میں تلاش کرتے ہیں۔ایک ایک آیت میں پانچ پانچ چھ چھ شانِ نزول۔شان نزول کو پس منظر میں رکھ کر آیت کی تفسیر تحریر کرتے ہیں اس طرح آیت کی عالم گیریت، ابدیت ختم ہوجاتی ہے آیات شک وشبہ سے بالاتر ہیں یقینی ہیں لیکن شان نزول اور روایات سب ظنی ہیں۔اس طرح یہ ساری تفاسیر ظنی ہوگئیں اور قرآن کے غلط ترجمے ہونے لگے احادیث میں عیسائیت کے زیر اثر عورتوں کے خلاف بہت زیادہ مواد تھا۔مفسرین اس سے متاثر ہوئے اور عورتوں سے متعلق تمام آیات کے ترجمے احادیث کی رو سے ہونے لگے۔

محترم معترض نے جو آیت تحریر کی ہے وہ سورہ النساء کی 34 ویں آیت ہے ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ (4:34) حضرت اقدس شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ انہوں نے اپنے اموال خرچ کئے۔زمخشری نے اپنی مشہور تفسیر ''کشاف'' میں قوامون کا ترجمہ تسلط جمانے والے کیا ہے۔جلالین نے اس کا ترجمہ مسیطرین کیا ہے جسے اردو میں داروغے کیا ہے۔یہ سب تراجم روایات کے تحت ہوئے ہیں۔آپ غور کریں اسی قرآن میں سورہ بقرہ میں ارشاد ہے جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ (2:228) جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں ہر ذمہ داری کے مقابلہ میں ان کا ایک حق ہے۔سارے قرآن میں ان کے لئے زوج کا لفظ استعمال ہوا ہے پھر اسی قرآن میں ان کے لئے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (2:187) آیا ہے آپ داروغے کا تصور ذہن میں رکھئے پھر ان آیات کو مطالعہ کریں یہ کس قدر تضاد ہے۔زوج داروغہ ہو ہی نہیں سکتا۔میاں بیوی کا جو تعلق ہے وہ باہمی مودت، سکینت اور رحمت کا ہے (30:21) اب آپ احادیث کے اثر سے باہر آیئے اور عربی کی مستند لغات ''لسان العرب اور تاج العروس'' کو consult کریں۔آخر عربی ادب کے دیگر مقامات پر بھی ان ہی کو consult کیا جاتا ہے جس طرح یہ وہاں حجت ہیں اسی طرح یہ یہاں بھی حجت ہیں۔ یہاں ان لغات کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔لسان العرب نے قام الرجل المراۃ و قام علیھا کے معنی مرد نے عورت کی کفالت کی کیا ہے۔قام علیھا کا مطلب وہ اس کو رزق پہنچانے کا کفیل بنا۔تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ ہے کہ وہ عورتوں کی کفالت کریں۔بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:34) کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔اگر اللہ تعالیٰ مردوں کو عورتوں پر فضیلت دیتا تو بما فضّلیھنّ کے الفاظ استعمال ہوتے کیونکہ الرجال اور النساء کے الفاظ پہلے آچکے ہیں اسکے بعد اسم ظاہر کا موقع نہیں تھا اس ضمیر کو ہی لانا کافی تھا اگر مقصود مردوں کو عورتوں پر فضیلت دینا ہوتا تو بما فضلھم علیھن آتا اور اگر اسم ظاہر استعمال کرنا ہی ہوتا تو پھر فضل الرجال علی النساء فرمایا جاتا لیکن اصل مقصد یہ کہنا ہے کہ بعض خصوصیات کے

لحاظ سے عورتوں میں مردوں سے زیادہ خصوصیات ہوتی ہیں ہم اس کی مثال پہلے بھی تحریر کر چکے ہیں۔ بعض مرد زیادہ صلاحیت والے ہوتے ہیں اور بعض عورتیں زیادہ صلاحیت والی ہوتی ہیں۔ ان کو نکمے مردوں پر فضیلت ہوتی ہے۔ ہر کنبے میں بعض خواتین زیادہ تعلیم یافتہ بڑے عہدوں پر فائز ہوتی ہیں انکو ہی اپنے کنبے کے ان لوگوں سے فضلیت ہوتی ہے جو ناخواندہ، اور کلرک یا Peon ہوتے ہیں۔ جو معنی معترضین اس آیت کا نکالنا چاہتے ہیں قرآن کے الفاظ ان کی تائید نہیں کرتے۔ قرآن کریم نے عورتوں کو حکومت کرنے کا اختیار بھی دیا ہے ہمارے ہاں بینظیر کی حکومت قرآن کے خلاف نہیں تھی (9:71)۔

(6) محترم معترض کا چھٹا اعتراض عورتوں کی وراثت میں آدھا حصہ ہونا ہے۔ متوفی کے ترکے کی تقسیم ایک فنی عمل ہے قرآن کریم نے صرف 2 آیات کے اندر وراثت کے سارے قوانین طے کر دیے ہیں۔ ان آیات کو سمجھنے میں Legal Acumens اور کچھ حساب کا علم دونوں چیزیں درکار ہیں۔ ہمارے مولویوں میں سے چند کو اس پر مہارت ہوتی ہے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں مفتی محمد جمیل کاندھلوی اور مولوی عزیز الرحمٰن بھی ترکہ تقسیم کرتے تھے۔ ہمارے ہاں درس نظامی میں سراجی پڑھائی جاتی ہے۔ اس سراجی میں وراثت کے قوانین قرآن کے خلاف ہیں۔ متوفی جو ترکہ چھوڑتا ہے قرآن کریم اس کو ایک اکائی unit قرار دیتا ہے قرآن کریم ان کی تقسیم حصوں میں کرتا ہے جو کسور Fractions کی صورت میں ہوتے ہیں مثلاً ماں باپ کا (1/6) حصہ ہوگا تھوڑا حساب جاننے والا بھی یہ سمجھتا ہے کہ ان حصوں کا Total سو آنا چاہیے جب ہی وہ حصص درست ہوں گے ہمارے علماء جب ترکہ تقسیم کرتے ہیں تو وہ Total سو نہیں آتا بعض مرتبہ مثلاً وہ 93 Total آ گیا تو یہ حضرات باقی 7 کو پھر اسی قوانین کے مطابق دوبارہ تقسیم کرتے ہیں۔ وراثت کی فنی اصطلاح میں یہ عول کہلاتا ہے۔ یہ عول قرآن کے خلاف ہے۔

عورتوں کی وراثت کے مسئلہ سے پیشتر چند باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ متوفی کے لئے مرنے سے پیشتر وصیت کرنا اس طرح فرض ہے جیسے روزے فرض ہیں دونوں کے لیے کتب علیکم کے الفاظ آئے ہیں (2:183، 2:180)، وصیت کرنا ہر شخص پر فرض ہے وصیت کے مطابق تقسیم کرنے کے بعد جو اثاثہ باقی رہ جاتا ہے ان کو ان قرآنی قوانین کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا ان دو آیات میں تین مرتبہ (4:11، 4:12) ترجمہ وصیت اور قرضہ ادا کرنے کے بعد اگر خدانخواستہ کوئی شخص فوت ہوتا ہے اس کے ایک لڑکا 20 سال کا تعلیم یافتہ ہے اسکے ایک 5 سالہ بچی بھی ہے جس کی ساری پرورش ابھی باقی ہے اس شخص کو چاہئے کہ لڑکے کو اپنے ترکہ میں سے بہت کم دے اور بچی کو اپنے ترکہ میں سے زیادہ دے۔ ہر شخص کو اپنی جائیداد کو اپنی مرضی کے مطابق تقسیم کرانے کا حق ہے قرآن کے وراثت کے قوانین کا اطلاق جب ہوگا جب کسی نے وصیت نہ کی ہو یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو Cover نہیں کر رہی ہو۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ قوانین غیر اسلامی مملکت میں جاری ہونگے۔ اگر مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی، اور اسلامی نظام جاری ہو گیا تو اس نظام میں ان قوانین کے اطلاق کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ تو عبوری دور کے قوانین ہیں اسلامی نظام میں فاضلہ دولت رکھنے کی اجازت ہی نہیں۔ نہ اس میں ذاتی املاک کی اجازت ہے۔

تیسری قابل غور بات یہ ہے کہ متوفی کے سارے حصص میں مرد اور عورت کی تفریق نہیں ہے اسی آیت کے اگلے حصہ میں (4/11) ماں اور باپ دونوں میں سے ہر ایک کا حصہ یکساں (1/6) ہے آپ دیکھیے کہ یہاں پھر مرد اور عورت میں

مساوات ہورہی ہے پھر بہن بھائیوں میں بھی ہر ایک کا (1/6) حصہ ہے یہاں بھی مساوات ہورہی ہے محجوب الارث میں بھی دادا، دادی کو 1/6 حصہ برابر ہے۔ تفریق صرف بیٹے اور بیٹی کے حصوں میں ہے کیونکہ مرد کے ذمہ عورت کی کفالت کی ذمہ داری ہے ہمیں اس فن پر مہارت نہیں شاید پھوپھی اور چچا اور ماموں اور خالہ کے حصوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہے البتہ یہ بات ہے کہ چونکہ مردوں اور عورتوں کے وظائفِ حیات مختلف ہیں اور قرآن نے خاوند کو کفالت کا ذمہ دار قرار دیا ہے اس لئے قرآن نے بیٹے اور بیٹی میں تفریق کی ہے۔ یہ مرد یا عورت ہونیکی وجہ سے نہیں اگر مرد اور عورت کی تفریق ہوتی تو وہ ہر جگہ تمام حصوں میں ہوتی۔ البتہ اعتراض کرنے والوں کو یہ شرم ضرور محسوس کرنی چاہئے کہ سب سے پیشتر اسلام نے وراثت میں عورتوں کا حصہ رکھا تھا۔ بہت سے ممالک میں ہندوستان سمیت اب بھی لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

(7) اس سے اگلا ساتواں اعتراض عورتوں کی شہادت پر ہے کہ قرآن نے شہادت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر شمار کیا ہے ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو عمداً اٹھایا گیا ہے ورنہ قرآن میں کسی جگہ بھی ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کو قرار نہیں دیا۔

قرآن کریم میں شہادت کے احکام آٹھ مقامات پر بیان ہوئے ہیں۔

(1) طلاق کی عدت گزارنے پر جدائی کے لئے یا تجدید نکاح کے لئے (65:2)

(2) عورتوں کی بے حیائی کے ارتکاب پر 4 گواہ لینے کا حکم ہے (4:15)

(3) تیسرے یتیموں کے اموال جب ان کے حوالے کئے جائیں تو حکم دیا گیا ہے کہ گواہ بنالو (4:6)

(4) چوتھے قذف کے سلسلہ میں شہادتوں کا ذکر ہے یہ سورہ نور میں آیا ہے (24:4)

(5) پانچویں وصیت کے سلسلہ میں شہادت کو ضروری قرار دیا گیا ہے (5:106)

(6) چھٹے، اگر عورت کے ورثاء کو شبہ ہو کہ جو دو گواہ وصیت کی گواہی دے رہے ہیں انہوں نے کوئی خیانت کی ہے۔

(7) ساتویں، شہادت لعان کے بارے میں آتی ہے۔

(8) آٹھویں شہادت مالی لین دین کے متعلق ہے اور یہی وہ آیت ہے جس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں جو سات مقامات یہاں بیان کئے گئے ہیں ان میں مردوں اور عورتوں کی گواہی ایک جیسی ہے ان سات مقامات میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے ہم نے صرف آیات کے حوالے تحریر کئے ہیں اصلی آیات آپ خود ملاحظہ فرمائیں اس آٹھویں مقام کی شہادت طویل ہے۔ ہم صرف جو حصہ نقل کر رہے ہیں جو اس مضمون کے سمجھنے میں کفایت کرجاتا ہے ارشاد عالی ہے فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (2:282) ترجمہ اور اگر کسی وجہ سے دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالینا چاہئے کہ ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

ہم نے شہادت کے آٹھ مقامات تحریر کئے ہیں شہادت کے سات مقامات پر عورتوں اور مردوں کا ایک درجہ ہے انکے مابین کوئی تفریق نہیں ہے دونوں یکساں ہیں ان سات مقامات کو تو معترضین نظر انداز کر جاتے ہیں صرف اس آیت پر اعتراض

کرتے ہیں حالانکہ یہ بھی بہت واضح آیت ہے۔ زیر نظر آیت میں شہادت کا تعلق صرف مالی معاملات سے ہے مالی معاملات سے عورتوں کو ذرا کم شناسائی ہوتی ہے مالی معاملات کے علاوہ جہاں بھی شہادت ہوئی وہاں اس آیت کا اطلاق نہیں ہوگا۔

مالی معاملات کی شہادت میں بھی گواہی صرف ایک عورت کی ہوگی دوسری عورت کا عدالت یا گواہی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا نہ وہ عدالت کو خطاب کرے گی گواہی صرف ایک عورت کی ہوگی اس دوسری عورت کے ساتھ جانے کی وجہ یہ ہے اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ (2:282) اگر ایسا ہو کہ گواہی دینے والی خاتون کسی وجہ سے Confuse ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی ہوئی اس کی دوسری بہن اسے یاد دلا دے لیکن اگر گواہی دینے والی خاتون کو کوئی الجھاؤ نہ ہو تو دوسری عورت کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی اور صرف ایک عورت کی شہادت کافی قرار دے دی جائے گی اس دوسری عورت کا عدالت سے کوئی تعلق نہیں وہ صرف گواہ خاتون کو خطاب کرے گی عدالت سے اسکا کوئی لینا دینا نہیں گواہی صرف ایک عورت کی ہوگی۔

قرآن کریم نے جس دور میں یہ حکم دیا تھا اور اس دور میں جس طرح کی خواتین ہوتی تھیں قرآن کریم نے اس کی کیفیت بیان فرمائی ہے اَوَمَنۡ يُّنَشَّؤُا فِى الۡحِلۡيَةِ وَهُوَ فِى الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ ﴿۱۸﴾ (43:18) ترجمہ جو زیورات میں پرورش پاتی ہے اور جھگڑے کے وقت اپنا مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر واضح طور پر Defend نہیں کر سکتی اور وہ وقت آنے پر، بوبو، بنی رہتی ہے۔ اس آیۃ کریمہ سے واضح ہے کہ اگر لڑکیوں کی تربیت زیورات میں کی جائے تو وہ ایسی ہوں گی لیکن اگر ان کو اعلیٰ تعلیم دی جائے مشکل معاملات پر انہیں Expose کیا جائے اعلیٰ درجہ کے عہدوں اور مناصب پر ان کو فائز کیا جائے انہیں حکومت کی مشینری میں شامل کیا جائے (9:71)۔ اس صورت میں دوسری عورت ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی قرآن میں اس قسم کے احکامات شرائط کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہتے اگر پانی مل جائے تو یتیم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے اسی طرح عدت کا معاملہ ہے۔

جو عورت اپنے شوہر کی وفات پر حمل سے ہوتی ہے اس کی عدت وضع حمل ہے (65:4)۔ اس سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ عورت کی عدت اسی لئے ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسکے پیٹ میں بچہ تھا اب چونکہ میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ ڈاکٹر زفوراً بتا دیتے ہیں کہ کوئی خاتون حمل سے ہے کہ نہیں اس لئے اب عدت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عورتوں کے حصوں کے بارے میں عزیز محترم نے جو اعتراضات کئے تھے ہم نے ان میں سے ایک ایک کا جواب دے دیا ہے عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں یہ مضمون یہاں ختم ہوتا ہے ان کے قرآن پر جو دیگر اعتراضات ہیں ہم ان کے جوابات دیتے رہیں گے جو سلسلہ وار ہر ماہ طبع ہوتے رہیں گے۔

ضمناً یہ ہے کہ قرآن جس طرح ہر معاملے میں احکامات دیتا جا رہا ہے یہ کوئی عام آدمی کے بس کی چیز نہیں ہے وراثت کے احکامات صرف دو آیات میں دے دیئے زبان اس جگہ اتنی ہے کہ اس کا لکھنا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے اگرچہ موضوع فنی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے زبان کا اپنا معیار قائم کیا ہے اس کو گرنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 27)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

چھٹا باب:

انسانی ذات کی نشوونما سے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی اہلیت کا حصول

کانٹ کا تیسرا اصول یہ ہے کہ:

Be a member of the kingdom of Ends_3

عالم مقاصد کے ایک رکن کی حیثیت سے عمل کر یعنی اخلاقی کردار کا کوئی اصول میرے لیے صرف اور صرف اسی صورت میں اخلاقی طور پر موزوں اور واجبیت رکھتا ہے جب میں اسے ایک ایسا قانون قرار دے سکوں جسے میں بطور آفاقی اصول اپنے اوپر عائد کرنا فرض سمجھتا ہوں۔

دیکھا جائے تو یہ اصول پہلے دو اصولوں کا نتیجہ ہے۔ اگر انسان ایک عالمگیر اصول اخلاق پر عمل کرتے، دوسرے انسانوں کو اتنا ہی اہم جانیں جتنا خود کو، تو وہ عالمِ انسانیت کے اِن مقاصد کا ایک فرد بن جائے گا۔

کانٹ کے یہ اصول اپنے اندر معنویت رکھتے ہیں۔ ان اصولوں پر اگر عمل کیا جائے تو اس میں انسانیت کا بھلا ہوگا، خود غرضی، استحصال ختم ہو جائے گا گویا یہ بھی ایک مثالی (Ideal) صورت ہے جس کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

لیکن یہ مقاصد کیا ہیں جو افادیت کے بغیر اپنا صلہ ہیں؟

کانٹ کہتا ہے کہ یہ وہی اصول یا قوانین ہیں جن تک انسان عملی عقل کی رو سے پہنچتا ہے۔ وہ عقل جو جذبات سے ملوث نہ ہو۔ اس کا نام کانٹ کی اصطلاح میں قانون حریت (Law of Freedom) ہے یعنی وہ قانون جس کی رو سے ایک صاحب عقل انسان اس وقت عمل کرتا ہے جب اس کی عقل اس کے جذبات و میلانات پر پورا پورا اقتدار رکھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں کانٹ کے نظریہ کی رو سے

خیر (Good) وہ ہے جسے ایک صاحب عقل وارادہ جذبات پر پورا پورا اقتدار رکھتے ہوئے لازمی طور پر اختیار کرے گا اور شر وہ ہے، جس سے اس قسم کا ارادہ لازمی طور پر مجتنب رہے گا۔ چنانچہ کانٹ کہتا ہے کہ:

''With all his failings, Man is still better than angels, void of will''

انسان اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود، آج بھی ان فرشتوں سے کہیں بہتر ہے جو ''ارادے'' سے عاری مخلوق ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حرمت و وقار کی حامل ایک ہستی ہے جس کا تعلق ایک ایسی دنیا سے ہے جو مقاصد اور نصب العین اقدار کی روشنی سے منور دنیا ہے۔ جس دنیا میں کہ وہ (انسان) بطور ایک مفید اور کارآمد شے کے طور پر، محض آلہ کار نہیں بنتا بلکہ یہ تو اپنی ذات میں ایک مقصد کلی ہے اور اسی ذات ہی سے اخلاقی قانون کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔

اسی لیے اخلاق کے مقصد کلی یعنی جوہر کا قانون کے ادراک سے استنتاج ہونا چاہیے کیونکہ اگرچہ فطرت میں ہر شے قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے مگر یہ اختیار صرف ایک عقلی وجود (ذات) کو حاصل ہے کہ وہ قانون کے مقاصد یعنی تصور کے مطابق عمل کرے۔

کانٹ کا خیال ہے کہ یہ امر اطلاقی کے تینوں اصولوں عقلی و منطقی لحاظ سے ہم وزن اور یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ امر اطلاقی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کوئی فعل صرف اور صرف اس وقت صائب ہے جب اس کی انجام دہی کے لیے عامل کا محرک اس کا یہ اقرار ہو کہ وہ فعل ان مخصوص حالات میں ایک صائب اصول کردار کا تقاضہ ہے۔ کوئی اصول یا کردار صرف اس وقت صائب ہے، جب ہر عاقل ہستی اس کو اپنے ذاتی اور داخلی محاسن پر قبول کرے، خواہ اس کے اپنے میلانات اور ذوقی رجحانات کچھ ہی ہوں۔ پس اسے ایک اصول ہونا چاہیے جو ہر عاقل کے لیے صرف اپنی داخلی صورت کی وجہ سے قابل قبول ہے۔ اور اس وجہ سے نہیں کہ یہ کسی مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے لے بمنزلہ ضابطہ ہے۔ اصول ہر عاقل کے نزدیک قابل قبول وہی ہوگا جس کے بارے میں ہر شخص استقلال سے خواہش کر سکے کہ سب کو اسے اختیار کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہم ان اصولوں کو کہاں سے لیں، جن کے متعلق ہم کہہ سکیں کہ یہ اپنی ذات میں خیر محض (Absolute good) ہیں تو کانٹ کہتا ہے کہ یہ اصول اس عقل انسانی کی رو سے حاصل ہوں گے جو جذبات سے ملوث نہ ہو۔ اس کے برعکس حکمائے مغرب اس بات پر متفق ہیں کہ عقل کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔ متاثر ہونا تو ایک طرف عقل کا تو فریضہ ہی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے۔ لہٰذا کانٹ کے موقف کو پرکھنے کے لئے عقل کے دائرہ کار کا تفصیلی جائزہ لیا جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

عقلِ محض کا دائرہ کار:

عقلِ محض کا دائرہ کار یہ ہے کہ وہ آپ کے جذبات کی تسکین کے لیے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ یہ جذبہ کس قسم کا ہے، اس سے عقلِ محض کو کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ آپ کے اس جذبہ کے جواز کے لیے دلائل بھی بہم پہنچائے۔ اس کے لیے نفسیاتی اصطلاح میں عقل وتاویل کی تعریف یہ لکھی ہے کہ:

''دلیل کے ذریعے اپنے عمل یا موقوف کو صحیح اور مناسب ثابت کرنا۔''

یعنی عقلِ محض اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے جواز کے لیے خوش آئند دلائل تراشے، جو درحقیقت کسی اور ہی جذبہ کے ماتحت پیدا ہو خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہو اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کام کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہے۔ علامہ اقبال کے اِلفاظ میں

عقلِ خود بین غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

بعض اوقات جذبات میں اندھی عقل، جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں خود اس شخص کو بھی دھوکہ دیتی ہے جس کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہوتی ہے۔ وہ اسے دکھا رہی ہوتی ہے کہ تمہارا فیصلہ یکسر صحیح اور حق بجانب ہے۔ اس کی عقل اس طرح جذبات کے تابع رہتی ہے کہ خود صاحب جذبات کو بھی محسوس نہیں ہونے دیتی کہ اس کے جذبات غلط ہیں جس کی وہ تسکین چاہتا ہے۔ جوڈ کے الفاظ میں:

''عقلِ محض اس قوت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ درحقیقت صحیح ہے۔'' اس بنا پر جوڈ عقل کو ''جذبات کی لونڈی'' قرار دیتا ہے۔

عقلِ محض کی یہی کوتاہ دامنی ہے جس کی بنا پر انسان خیر کی بجائے شر کی آرزو کرتا رہتا ہے۔

قرآن سے بھی اس بات کی تائید ملتی ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ (17:11)

''اور جس طرح انسان اپنی خیر کی دعائیں مانگتا ہے۔ اسی طرح (بسا اوقات) شر بھی مانگنے لگتا ہے (اگرچہ نہیں جانتا کہ یہ اس کے لیے برائی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔''

جذبات، خواہشات یا آرزوں کو اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے گا۔ اس لیے قرآن کریم نے ان خواہشات کو جو وحی کی عائد کردہ پابندیوں کے تابع نہ ہوں، شر کا موجب قرار دیا ہے۔ ہر آرزو کو عقل کے تابع ہونا چاہیے اور عقل کو وحی کی روشنی میں چلنا ہوگا۔ اس سے انسان کی انفرادی زندگی کی نشوونما (خیر) حاصل کر سکتی ہے اور ان کی حیات اجتماعیہ بھی۔ کانٹ نے فرض کے فہم کے لئے مُطلق عقلِ محض پر بھروسہ کر کے اِس کے دائرہ کار کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ عقلِ محض کا اپنا دائرہ ہے اور اس کی فضیلت و افادیت اسی دائرہ کے اندر ہے۔ اس دائرہ سے آگے اس کے لیے وحی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیت ہے کہ آنکھ کی قوت بڑھانے کے لیے خارجی امداد کی ضرورت ہے۔ اندھیرے میں آنکھ بالکل نہیں دیکھ سکتی۔ تھوڑی سی روشنی (جو خارج سے آتی ہے) قوت بینائی کو بڑھا دیتی ہے۔ جوں جوں روشنی تیز ہوتی جائے حدنگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر اگر اس روشنی کے ساتھ دوربین بھی ہو تو ان

حدود کی وسعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں تنہا آنکھ کو بھی نظر نہیں آسکتیں وہ خوردبین اور دوربین کی مدد سے کھلی کھلی اور نکھری نکھری سامنے آجاتی ہیں۔ جس طرح خارجی اثرات سے ان ذرائع احساس کے حدود وسیع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح قوت فکر کی حدود بھی وحی کی روشنی سے کشادہ دامن ہو جاتی ہیں۔ تنہا عقل ظن وتخمین کی وادیوں میں محو حیرت سرگرداں رہتی ہے لیکن وحی کی روشنی میں یقین کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اور دلیل محکم! وحی انسانی حیات اجتماعیہ کے لیے اصول متعین کرتی ہے اور پھر عقل سے کہتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات متعین کرے اور اِن کی تنقید وترویج کے لیے اسباب وذرائع تلاش کرے۔

کانٹ کے بیان کئے گئے فرض کی روشناسی کے لئے ذرائعِ علم:

قرآن کی رو سے علم کے حصول کے دو ہی ذرائع ہیں۔

(1) عقل انسانی

(2) قرآن حکیم

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اگر جذبات اور عقل کو وحی خداوندی (جواب مکمل شکل میں قرآن میں آخری پیغام کے طور پر محفوظ ہے) کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو انسان، ذات کی نشوونما کی فہمِ فرض کی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے

اسے مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ:

1۔ عقل انسانی کی قیمت ایک ''قوت'' ہے جس طرح اس قوت کا استعمال کیا جائے، اسی نسبت سے اس کے نتائج مرتب ہوں گے۔

2۔ جب عقل انسانی (جذبات سے الگ ہو کر) خارجی کائنات کے رموز واسرار کی تحقیق وتفتیش کرتی ہے تو وہ اپنے تجرباتی طریق سے صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

3۔ لیکن انسان کے باہمی معاملات میں یہ عقل جب جذبات کے تابع چلتی ہے یعنی جب اس قوت کو انسان کے جذبات استعمال کرنے لگ جاتے ہیں تو دنیا میں عقول کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ فساد فی الارض کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

4۔ جذبات، انسانی عمل کے محرک ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی انسان کی بڑی متاع اور عظیم قوت ہیں، لیکن یہ قوت اس صورت میں تعمیری نتائج پیدا کرسکتی ہے جب اسے عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے۔

5۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقل کو ان مستقل اقدار کا محافظ بنا دیا جائے جو انسان کو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ جب انسان جذبات سے الگ ہو کر علم وبصیرت کی رو سے غور وفکر کرے تو ان اقدار کے فرض ہونے کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور یوں اس کی عقل ان کی حفاظت اور نگہداشت کو اپنا فریضہ قرار دیتی ہے۔

6۔ یوں انسان کے جذبات اور اس کی عقل (دونوں عظیم قوتیں) کانٹ کے بیان کردہ فرض کے معین کردہ نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہیں حکمائے مغرب بشمول کانٹ عقلِ محض کے علاوہ کسی علم کو سند نہیں مانتے اور انہی کے نمائندے جوڈ کا خیال ہے کہ اِنسانی عقلِ کی کسی شکل کا وجود ہی نہیں مِلتا جو جذبات سے متاثر نہ ہو۔

ہمارے نزدیک محض عقل پر انحصار کرنے کی ایموئیل کانٹ کی مجبوری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وحی اپنی اصلی اور منزہ شکل میں صرف قرآن میں محفوظ اور دستیاب ہے۔ اسے اس حالت میں کانٹ جیسے مفکرین کے سامنے رکھنے میں نہ تو ان کو کوئی مدد اور تسلی بخش تعاون مہیا کیا گیا اور لاعلمی کی بنا پر نہ ان کی طرف سے اس کے حصول کے لیے خاطر خواہ کاوشیں کی گئیں۔ عقلی غور و فِکر اور تدبر پر قرآن بھی بہت زور دیتا ہے، اس لیے کانٹ کی اس کاوش کو تحسین کی نظروں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ عقلی غور وفِکر اور تدبر کے ذریعے انسانی ذات کی نشوونما کے لیے فہمِ فرض کی روشناسی کی سند میں عملی عقل کے نام سے بے شک نامکمل حالت ہی میں سہی، لیکن قرآنی تعلیمات کی مطابقت اپنا مؤقف رکھنے میں ضرور کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

کانٹ کے اخلاقی نظریہ کا تنقیدی تجزیہ:

دیکھا جائے تو کانٹ کے اخلاقی نظریہ پر سب سے بڑی تنقید یہ کی جاتی ہے کہ اس میں صرف صورت موجود ہے۔ مواد نہیں ہے۔ کانٹ کے صوری معیار فراہم کرنے میں خرابی نہیں ہے۔ یقیناً وہ اس کی سوچی سمجھی خواہش بھی رکھتا تھا۔ اِسی طرح جیسے ایک ماہر منطق قیاسی شکل فراہم کرتا ہے جس میں اس قسم کے سارے صحیح دلائل کو ڈھلنا چاہیے۔ مزید اِسی طرح کانٹ نے اپنے اصول سے ایک قاعدہ فراہم کرنے کی توقع کی، جس سے ہر اخلاقی قانون کو مطابقت رکھنا چاہیے۔ اگر وہ مواد کی فراہمی کا کام سرانجام دے سکتا تو کوئی اس سے انکار نہ کر سکتا کہ اس نے نظریہ اخلاق کی انتہائی قابل قدر خدمت انجام دی ہوتی۔ کانٹ کے اصول میں خرابی یہ نہیں ہے کہ وہ بذات خود صوری ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کا نیک ارادہ کے حامل مثالی معاشرہ میں مقید ہو کر دوسری صورتوں میں صحیح طور پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ کانٹ نے عقل پر زور دینے کی وجہ سے احساسات اور انسانی میلانات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں نظر انداز نہ کرنے کی بجائے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کانٹ نے ان کو عالمگیر کے فوری اصول میں مقید کر دیا ہے۔ لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ کانٹ خالص حکمائے یونان کی پیروی میں انسان کا انسان کہلانے کی صفت سے متصف ہونے کے لیے لازمی سمجھتا ہے کہ اس کے جذبات پر اس کی عقل کا کنٹرول ہو۔ عقل کی غیر موجودگی میں کئے گئے اعمال کو حیوانی درجہ کے اعمال سے نسبت دی گئی ہے، جو انسانی اعمال میں تبھی شامل ہوں گے، جب انسانی عقل کے محاسبے سے ان کا گزر ہو۔ یہی اس کا نقطۂ نظر ہے۔

کانٹ کے نظریہ کی اصل روح یہ ہے کہ وہ ایک ایسے لازمی اور مکتفی معیار کی نشاندہی کرے جس سے ہر اصول کردار کو صائب گردانے اور عمل میں لانے سے پہلے جانچا جائے۔ ہمارے مطالعہ میں ہے کہ ایسے لازمی، خود مکتفی اور مُطلق معیار کے

لئے قرآن اللہ کی صِفاتی ذات کو انسان کے لئے اپنے اندر منعکس کرنے کے عمل سے اللہ کے رنگ میں رنگے جانے میں دیکھتا ہے۔ یہ طویل بحث ہے، جس کا ہم جلد ہی ایک باب مختص کر کے جائزہ لیں گے۔

کانٹ کے نزدیک جو خصوصیت عمل ارادہ کو صائب بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے عقلی طور پر انجام پانا چاہیے۔ ہم کانٹ کے نظریے کو کسی قدر غیر محتاط طور پر ایک جملے میں پیش کر سکتے ہیں۔

''کوئی عمل اس وقت تک صائب نہیں ہوسکتا جب تک اس کے لیے کوئی عقلی وجہ پیش نہ کی جا سکے۔''

کانٹ کی تحریوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جو عمل، عمل کرنے والے کی میلان طبع کی وجہ سے انجام پاتا ہے وہ اخلاقی لحاظ سے کبھی اچھا نہیں ہوسکتا۔ لیکن کانٹ کے نظریہ کی زیادہ صحیح توجیہہ یہ نظر آتی ہے کہ میلان کی موجودگی یا عدم موجودگی کا اخلاق سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کسی عمل کے اچھے ہونے کے لیے کانٹ زیادہ سے زیادہ اس بات کو لازمی قرار دے سکتا ہے کہ اگر ذہن میں اسے انجام دینے کا میلان نہ بھی ہو تب بھی عامل اسے احساس فرض کے تحت انجام دے۔ اس ضمن میں البتہ اکثر حکمائے مغرب اسے تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سی مثالوں میں وہ عمل جو پورے طور پر آمادہ ذہن سے انجام دیا جاتا ہے صورت حال سے زیادہ موزونیت رکھتا ہے اور زیادہ بہتر نتائج کا حامل ہوتا ہے، اُس عمل سے بہتر ہے جو بطور فرض، لیکن تکلیف دہ احساس کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھے آدمی کو ایسے اعمال کی انجام دہی کی طرف مائل ہونا چاہیے اور اگر میلان موجود نہ ہو تو پورے عمل کی قدر و قیمت کم ہوجاتی ہے۔

اِرتقائی نشوونماء کے حصول میں توازن بدوش باہمی ربط کا اصول:

قرآن کے نظریۂ ارتقاء کی روشنی میں، ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کے قانونِ تخلیق کی ایک شق یہ ہے کہ ہر شے میں کچھ امکانی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں، اور ان مضمر قوتوں کی نشوونما کر کے انہیں تکمیل تک پہنچانا ان اشیاء کا مقصودِ حیات ہے۔ مثلاً بڑ کے بیج کا بڑ بن جانا۔ لہٰذا کامیاب درخت وہی کہلاتا ہے، جو اپنے انتہائی مقام تک جا پہنچے۔ جو راستے میں سوکھ جائے، اسے کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی مضمر قوتیں بہ تمام وکمال نشوونما نہیں پاتیں۔ اس کی ممکناتِ زندگی تزکیہ یاب نہیں ہوتیں، غیر مکمل رہ جاتی ہیں۔ قانونِ حیات یہی ہے کہ جو بیج نشوونما پا گیا، وہ کامیاب ہوگیا۔ جو مٹی کے تودے کے نیچے دب کر رہ گیا، وہ نامراد رہا۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ ایک ننھا سا بیج کس طرح منازل طے کرتے ہوئے تناور درخت کی شکل میں پھل لانے کے قابل ہوتا ہے۔ ایسا صرف تنہا بیج کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اس میں مٹی، نمک، پانی، ہوا، روشنی اور حرارت کے عناصر باہم دگر مدغم ہوتے ہیں۔ پھل، گویا ان سب عناصر کی ارتقاء یافتہ شکل کا نام ہے، جو سینکڑوں گردشوں کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے۔

قانونِ تخلیق کی دوسری شق یہ ہے کہ کوئی قوت انفرادی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے نشوونما نہیں پاسکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوتیں بھی اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر دیں، اور اس طرح یہ تمام قوتیں ایک دوسرے میں

سموکر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ نشوونما کا راز ربطِ باہمی میں ہے۔

یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے یا دبائے رکھے۔ کائنات میں یہ صلاحیتیں دوسری خارجی قوتوں کے جذب ہونے سے نشوونما حاصل کرتی ہیں۔ اس امتزاج کے لئے ایک خاص توازن وتناسب بھی لاینفک ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا، نہ صرف نشوونما رک گئی بلکہ بیج کی تمام امکانی قوتیں سلب ہوکر رہ جاتی ہیں۔ یہ توازن، تب بگڑتا ہے، جب متضاد قوتوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ ان میں توازن قائم رہے، تو ان کی باہمی کشمکش ختم ہوجاتی ہے، اور وہ باہمی امتزاج وائتلاف سے خود اپنی نشوونما کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

انسانی طبیعی زندگی کی نشوونماء کا اِجتماعی نظامِ عدل کے اندر ممکن العمل ہونا:

اِنسانی ذات کے مُنکر کا نظریہ ہے کہ انسان کی زندگی طبیعی زندگی ہے، لیکن چونکہ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے اِس لئے اس کی زندگی انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ یعنی اِس نے معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں، جن سے معاشرہ کے مختلف افراد میں ٹکراؤ نہ ہو اور سب امن چین اور خوشحالی وفارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد کے لئے سوسائٹی کچھ قوانین وضوابط مرتب کرتی ہے، جن کی پابندی سب افراد کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جو اِن قوانین کو توڑتا ہے، معاشرہ اِسے مجرم قرار دے کر، قانون شکنی کی سزا دیتا ہے۔ اسے معاشرہ کا نظامِ عدل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت قانونِ مکافاتِ عمل ہی کی ایک شکل ہے لیکن معاشرے کے قانون میں اور طبیعی قانون میں کچھ فرق ہے، اور وہ فرق بڑا اہم ہے۔ معاشرہ کے نظامِ عدل کی رو سے ہوسکتا ہے کہ

1۔ ایک شخص قانون شکنی کرے، لیکن نظامِ عدل کی گرفت میں نہ آئے۔

2۔ گرفت میں آئے بھی، تو کسی نہ کسی طرح اپنے جُرم کی سزا سے بچ جائے۔ رشوت سے، سفارش سے، یا فریب دہی وغیرہ سے۔

جو شخص اِس طرح قانون شکنی کی سزا سے محفوظ رہ جائے، اس میں اور اُس شخص میں جس نے قانون شکنی نہیں کی تھی، کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں سوسائٹی کی نگاہ میں یکساں ''مملکت کے پُرامن شہری'' ہوتے ہیں۔ جب معاشرہ میں قانون شکنی عام ہوجائے، تو قانون شکن اِن لوگوں کے مقابلہ میں، جو قانون کی پابندی کرتے ہیں زیادہ مزے میں رہتے ہیں کیونکہ یہ جائز اور ناجائز ہر طریق سے مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ذات کی نشوونما بھی انفرادی طور پر نہیں، بلکہ انسانی معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ نظریۂ پاکستان بھی اس کی تائید، اس اضافہ سے کرتا ہے کہ ذات کی نشوونما کی تکمیل ایک قرآنی معاشرہ میں ہوسکتی ہے، جسے اسلامی حکومت کہتے ہیں۔

حیوانی زندگی کی صلاحیتوں کی نشوونما کے اصول کی دوسری شق کا اطلاق جب انسانی زندگی پر ہوتا ہے تو اس رابطہ باہمی کا نام اجتماعی نظام یا معاشرہ کہلاتا ہے۔ قانونِ تخلیق کی اس شق کے مطابق افرادِ انسانیہ انفرادی طور پر اپنی مضمر صلاحیتوں

کونشوونما دے ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی صلاحیتوں کو ایک کُل میں سمو دیں، اور اس عملِ ائتلاف سے نشوو ارتقاء کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔

انسانی ذات کی نشوونما کا اقدارِ خداوندی کی پیروی میں ممکن العمل ہونا:

اقدار خداوندی کا تعلّق انسانی ذات سے ہے، جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسانی ذات مستحکم اور نشوونما پاتی ہے۔ محض خدا کے ماننے سے کوئی شخص مومن یا مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو دنیا کی اکثریّت تو خدا کا اقرار کرتی ہے، پھر تو دنیا کی اکثریّت مسلمان یا مومنین ہوتے۔ قریش مکّہ خدا کو مانتے تھے، لیکن مسلمانوں کے شدید ترین دشمن یہی تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ مومنین، خدا اور اپنی ذات کا اقرار کرتے تھے، جبکہ قریش خدا کا تو اقرار کرتے تھے، لیکن وہ اپنی ذات کے منکر تھے۔ آج ساری دنیا میں چاہے وہ مسلمان ہوں یا کوئی اور مذہب رکھتے ہوں، وہ انسانی ذات کا انکار کر رہے ہیں۔ سائنس آج، اور قرآن شروع سے بتا رہا ہے کہ حیوانات کی سطح تک انسان اور حیوان رحم مادر میں ایک جیسے ہی مدارج طے کرتے ہیں۔ رحم مادر میں بکری کا بچہ بھی وہی مدارج طے کرتا ہے، جو انسان کا بچہ طے کرتا ہے۔ لیکن انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ ہی وہ حیوانات سے مختلف مخلوق بن جاتا ہے (14:23) یعنی اوروں سے کچھ اور مخلوق بن جاتا ہے۔ انسان، آدمی پیدا ہوتا ہے، اور اس کو الہیاتی توانائی کے ذریعے عطا کی گئیں خوابیدہ خدائی صفات کو اپنے اندر اجاگر کر کے، انسان بننا ہوتا ہے۔ انسان بنا بنایا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس حیوان بنا بنایا پیدا ہوتا ہے۔ حیوان کو صرف پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مرتے دم تک حیوان ہی رہتا ہے، اسے حیوان سے آگے کچھ اور نہیں بننا ہوتا۔ بکری آج بھی بکری ہے، اور دو لاکھ سال پہلے بھی یہی بکری تھی۔ انسان، حیوانات کے مقابلے میں، کچھ خوابیدہ صلاحیّتیں لے کر پیدا ہوتا ہے، جن کی اسے طبیعی جسم میں رہتے ہوئے نمود کرنا ہوتی ہے۔ ان صلاحیّتوں کی نمود سے ہی انسان آدمی سے انسان بنتا ہے۔ انسان بن جانے کے عمل کا نام اسلام ہے، اور انسان بن جانے کے عمل کا لازمی نتیجہ مومن ہونا ہے۔ انسان اور حیوان کے طبیعی جسم میں صرف پرورش ہوتی ہے، ارتقاء نہیں ہوتا۔ ارتقاء ہوتا ہے تو صرف انسانی ذات کی صلاحیّتوں میں۔ اپنی ذات کی صلاحیّتوں میں قوانین خداندی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے نمود یا ارتقاء کرتے چلے جانا، یہ انسانی ذات یا انسانی نفس پر ایمان ہے، کیونکہ اقدار خداوندی کے مطابق زندگی وہی بسر کرے گا، جس کو اپنی ذات پر ایمان ہو۔

انسان جتنے بھی اعمال کرتا ہے، اس کے دو قسم کے اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے اثرات تو وہ ہیں، جو انسانی ذات کو مستحکم کرتے ہیں، اور اس کی صلاحیّتوں میں نشوونما کرتے ہیں، ایسے اثرات اقدار خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مرتّب ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے اعمال (بشمول خیالات، میلانات، رجحانات اور ارادہ) وہ ہیں جو ذات کو غیر مستحکم کرتے ہیں، اور اس کی صلاحیّتوں میں نشوونما پیدا کرنے کی بجائے صلاحیتوں کو دبا دیتے ہیں۔ پہلی قسم کے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی رو سے ہوتے ہیں، جن سے انسان کی ذات متوازن ہوتی چلی جاتی ہے (37:18)

اور دوسری قسم کے اعمال، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر نہ کرنے کی رو سے ہوتے، اس لئے ان کے اثرات سے ذات میں اضمحلال یعنی ضعف پیدا ہوتا ہے، ذات اسفل ہو جاتی ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (95:5) کچھ بنا ہوا انسان بھی واپس حیوانی سطح پر چلا جاتا ہے۔

انسانی ذات پر ایمان ہی انسان کو غیر اقداری اعمال سے بچا سکتا ہے، کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ذات میں اضمحلال پیدا ہو جانے سے وہ سراسر خسارے میں رہے گا۔ انسانی ذات کی نشوونماء کے حصول میں قرآن کا بنیادی اصولِ بقاء و ارتقاء کائنات کے ثبات اور بقاء کے لئے یہی اصول کلّی بیان کیا جاتا ہے کہ جو انفرادی مفاد خویش کی بجائے، کُلی انسانیت کے مفاد کا حامل ہو۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (17:13)

جس نظام کا مطمحِ نگاہ نوع انسانی کی منفعت ہوتا ہے، وہ باقی رہ جاتا ہے۔

یہ ہے وہ محور، جس کے گرد قرآن کا نظریہ ارتقاء کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ مغربی سیاست دانوں نے قانون ارتقاء ''بقاء للاصلاح'' بتایا یعنی بقاء اسی کے لئے ہے جس میں صلاحیّت ہے۔ مگر قرآن نے ''بقاء للانفع'' بتایا یعنی بقاء انسانیّت کی منفعت میں ہے۔ اصلح اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے اور انفع عالمگیر انسانیّت کے لئے ہوتا ہے۔ زندگی کے طبیعی مرحلے میں ارتقاء کے طبیعی موانعات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر طبیعی موانعات نہ ہوتے تو زندگیاں پروان نہ چڑھ سکتیں کیونکہ ارتقاء کے لئے موانعات کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اب جبکہ انسانی زندگی کو غیر مرئی ذات عطا ہوئی تو غیر طبیعی ذات کے ارتقاء کے لئے غیر طبیعی موانعات کی بھی ضرورت تھی۔ خدا نے انسان کو ذات عطا کرنے کے ساتھ ہی طبیعی موانعات کو تو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے، اور انسانی ذات کے ارتقاء کے لئے، خدا نے شیطان کی عقلِ خود بیں کی صورت میں غیر مرئی موانعات کا انتظام بھی کر دیا، تاکہ انسانی ذات اِس پر قابو پاتے ہوئے ارتقائی مراحل طے کر سکے۔ اگر طبیعی زندگی میں طبیعی موانعات نہ ہوتے، تو زندگی انسانی پیکر میں نہ پہنچ پاتی، بلکہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پاتی۔ اسی طرح اگر شیطان نہ ہوتا تو انسان، زندگی بعد زندگی میں جنّت کا مستحق ہونے کے لئے ذات کی نشوونماء کبھی نہ کر پاتا۔ انہی جنّتی زندگی کے مستحق افراد پر مبنی قرآن ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لیے مصروف سعی و عمل رہتا ہے اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ فرض سمجھ کر اس لیے کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی اور یہی اس کی زندگی کا منشاء و مقصود ہے۔

قرآن ذات کی نشوونماء کے لئے بنیادی اصول یوں پیش کرتا ہے کہ اِس کے حصول کا طریقِ کار یہ ہے کہ: اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ (92:18) ''نشوونما اس سے ہوتی ہے، جو اپنے مال کو دوسروں کی بہبود کے لئے دیتا ہے''۔

اس آیت میں مالہ میں عموماً مَال اور ہٗ کی ترکیب کے تحت ''اس کا مال یا ملکیت'' کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ مالہ کی ایک دوسری ترکیب بھی ہے جو مَا لَہٗ ہے۔ مَالَہٗ کے تحت پہلے مفہوم کو وسعت دے کر اس میں بشمول مال کے، دیگر وہ تمام صلاحیتیں

بھی شامل ہو جاتی ہیں، جو فرد کو خدا کی طرف سے بطورِ نعمت و فضل عطا ہوتی ہیں۔ قرآن کی عمومی تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے تو دوسرا مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ دوسروں کی بہبود کے لئے ذات کی نشوونما کا نظریہ وہی کہلاتا ہے، جو انفرادی مفادِ خویش کی بجائے، کلی انسانیت کے مفاد کا حامل ہو۔ قرآن ایسے ہی راستے کو بقاء کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اسکی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ دوسروں کی نشوونما کو نظر انداز کر دے۔ اس کا پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشوونما کرتا ہے، اسی قدر اسکی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔

قرآن نے انسان کو بطور فرد نعمائے خداوندی کا مالک بنا کر اِن نعماء کو اپنے اور اولاد کے لئے جمع کر لینے کی ہدایت نہیں کی۔ اس کے برعکس اسے اس کی تحویل میں دیتے ہوئے اور امین کا درجہ دیتے ہوئے اسے فی سبیل اللہ کھلا رکھنے کی یعنی العفو کی ہدایت کی ہے۔ اس سے مقصد نوعِ انسانی کی بہبود کا سامان کرنا ہے نہ کہ انسان کے صِرف جبلی تقاضوں پر مبنی خواہشات کا اتباع۔

العفو اور اُس میں مُضمر جذبہِ محرکہ کا قرآنی مؤقف

قرآن میں ہے کہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ (2:219)

''اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا اور کِس حد تک انفاق (فی سبیل اللہ) کریں۔ کہہ دے، وہ سب کا سب، جو بچے اپنی ضروریات سے۔'' قرآن کا مؤقف ہے کہ انفاق مالہ فی سبیل اللہ میں فرد کی خود اپنی ذات کی نشوونماء ہی کا باعث ہوتا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ (2:272)

''اور جو کچھ مال و دولت تم (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہو، وہ تمہاری ذات کے فائدے ہی کے لیے ہے۔''

یہاں قرآن نے نفس کی تصریح کر دی ہے کہ فائدہ سے مراد انسانی جسم کا نہیں بلکہ انسانی ذات (نفس انسانی) کا فائدہ مقصود ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ طبیعی جسم کی پرورش کے لیے قانون یہ ہے کہ ہر فرد کے جسم کی پرورش اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھاتا ہے یہ ناممکن ہے کہ اچھی خوراک تو میں کھاؤں اور پرورش میرے بھائی کے جسم کی ہوتی چلی جائے یہ خود غرضی ہے جس سے طبیعی سطح پر کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے، جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لیے دے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے حیوانی (یعنی طبیعی) زندگی اور انسانی (یعنی ذات کے تصور پر مبنی) زندگی کے راستوں میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔

ہم سبھی کو معلوم ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنی ہنرمندی، استعداد اور صلاحیت کی بناء پر کماتا ہے، اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہوسکتا۔

قرآن نے بھی بنی اسرائیل کے قارون کو سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ جب اس سے کہا گیا کہ وہ اس تمام (فاضلہ) دولت جو اسنے یوں جمع کر رکھی ہے، اُس پر اوروں کا حق کیوں نہیں سمجھتا تو اس نے جواب دیا:

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ (28:78) ''یہ دولت مجھے میری ہنرمندی کی بدولت ملی ہے۔''

یعنی میں نے اسے اپنے علم اور ذاتی استعداد سے کمایا ہے۔ اس لیے اس میں کسی دوسرے کے حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرے مقام پر اسی جواب پر قرآن نے کہا ہے کہ:

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ؕ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ (49:39)

''ان لوگوں کی یہی اپنی ذاتی ہُنرمندی کی کمائی ہونے کی ذہنیت ہے جو اصل مصیبت کا باعث ہے۔ لیکن انمیں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے۔'' کہا جا سکتا ہے کہ تو قرآن کا مؤقف ہے، لیکن حکمائے مغرب عقلِ محض کے علاوہ کسی علم کو نہیں مانتے۔ لہٰذا عقلِ محض کی روشنی میں بھی دیکھا جائے تو بھی یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ انسان نے اپنی کمائی کی ہنرمندی حسبِ ذیل مجموعی کارکردگی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ان پر اس نے کوئی محنت نہیں کی ہوتی۔

1۔ دماغی صلاحیت جو ہر بچے کو پیدائشی طور پر ملتی ہے۔

2۔ ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت کے اثرات

3۔ صلاحیت اور استعمال کے مواقع اور

4۔ انسان کی ذاتی محنت کے مواقع

اِن بلامحنت ذرائعِ حصول کے باوجود انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے اسے پوری طرح بطورِ حق اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ قرآن کا مؤقف ہے کہ اللہ نے اِن نعمائے خداوندی کو انسان کی تحویل میں دیا ہے تاکہ اس کو اس کی ہدایت کے مطابق استعمال میں لایا جائے۔ نظامِ سرمایہ داری کے حاملین اس ہنرمندی کو ذاتی ملکیت اور حسبِ خواہش اس کے استعمال کو انسانی فطرت پر محمول کرتے ہیں۔ فطرت کا تجزیہ کیا جائے تو انسان کی کوئی فطرت ہوتی ہی نہیں، کیونکہ فطرت میں تو مجبوری پائی جاتی ہے اور انسان مجبور نہیں ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے برعکس ہنرمندی میں فضل ہونے کا باعث ذاتی ملکیت کا دعویٰ بلاجواز ہے کہ:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ (16:71)

اللہ نے تم میں بعض کو دوسرے پر اکتساب رزق کی استعداد میں فضیلت دی ہے جنھیں یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ زیادہ رزق کو ان لوگوں کی طرف نہیں لٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں تاکہ یہ سب رزق میں برابر ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ انھیں استعداد کی زیادتی خدا کی طرف سے بطور نعمت ملی ہے یعنی ان کے ذاتی کسب و ہنر کی پیداوار نہیں۔ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعماء میری اپنی نہیں ہیں، خدا کی عطا کردہ ہیں لہٰذا، ان سے فائدہ خدا کے قوانین کے مطابق ہی اٹھایا جا سکتا ہے، جس کی کہ یہ اشیاء ملکیّت ہیں۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)

اور جو کچھ بھی زندگی کی نعمتیں (بشمول کسب و ہنر کی صلاحیتیں) تمہیں نصیب ہیں، سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔

نعمت لفظ میں ہر قسم کی خوشگواریاں، سہولتیں اور سہولتوں کا سامان، ضروریات زندگی کے لئے سامانِ رزق، سرفراریاں، غرض آسودگیوں کی جتنی چیزیں آپ کہہ سکتے ہیں، وہ سب اس ایک لفظ نعمت میں آجاتیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے مطالبے کے مطابق ہم اپنی محنت کے ماحاصل کو دوسروں کے لئے کیوں کھلا رکھیں؟ اس کا جواب ان چار لفظوں میں آ گیا کہ جو کچھ تمہارے پاس نعمتیں ہیں، وہ تمہاری نہیں ہیں۔ پھر وہ کس کی ہیں؟ جواب میں کہا: فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ''وہ خدا کی ہیں، خدا کی طرف سے ہیں''۔ لہٰذا، اگر تم اپنی محنت کے ماحصل میں سے، دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دو گے، تو تم سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مطابق اپنی تو کوئی چیز نہیں دے رہے ہو گے، وہ تو تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو دوسروں کو دو گے، پھر بخیلی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا نے یہ نعمتیں بلا مزد و معاوضہ تم کو دی ہیں، یہ تو فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کی اپنی صلاحیتیں اور استعداد تک بھی خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اگر اشیاء کو فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) نہ سمجھا جائے، اور اپنی صلاحیتوں اور کائنات کے ذرائع و وسائل رزق کو اپنا ذاتی سمجھ لیا ہے، تو پھر یہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد تو بن سکتا ہے، لیکن نظام ربوبیّتِ خداوندی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) سے ایک عالمگیر نظام ربوبیّت کی بنیاد پڑتی ہے اور اشیاء و صلاحیتوں کو اپنا سمجھ لینے سے ایسا نظام استوار ہوتا ہے جس میں یکسر تخریب، فساد اور ناہمواریاں ہوتی ہیں۔ انسانوں میں صلاحیتیں اور استعداد کم و زیادہ ہوتیں ہیں، اس لئے کوئی کم کما سکتا ہے تو کوئی زیادہ کما سکتا ہے۔ مثلاً بچے بوڑھے گھروں میں کما نہیں سکتے، لیکن ان کی کمیاں پوری کرنے پر توجہ ہر گھر میں دی جاتی ہے۔ انسان جس کو ''میری'' یا ''میرا'' یا ''ہمارا'' کہتا ہے وہ سب عطیّہ خداوندی ہوتا ہے۔ ہاں! اگر کسی چیز کو وہ اپنی کہہ سکتا ہے، تو وہ اس کی اپنی محنت کا صلہ ہے۔ اسی بات کو قرآن نے یوں کہا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (53:39)

''جن صلاحیتوں اور سہولتوں کے ذریعے انسان کماتا ہے، اس میں سے وہ صرف اپنی محنت کا حصّہ لینے کا حقدار ہے، اس سے زیادہ کا نہیں''۔

قرآن کی اصولِ العفو کی وضاحت میں نظامِ فطرت سے شہد کی مکھی کی مثال:

قرآن میں سورہ النحل کی آیت 69 میں مکھی کی کوششوں سے شہد بنانے اور اسے نوعِ انسانی کے استعمال کے لئے کُھلا رکھنے کی مثال سے قرآنی نظریہ العفو کی وضاحت کی گئی ہے کہ:

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (16:69)

(اور شہد کی مکھیوں کو، یہ بھی وحی کیا گیا کہ) ہر قسم کے پھولوں، پھلوں سے رس چوستی پھرے، اور نہایت فرماں اُس ودیعت

کردہ خدا کے قانون ربوبیّت پر چلتی جائے، جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ (اس فرماں پذیری سے) اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا رس (شہد) نکلتا ہے، جس میں (غذائیّت کے علاوہ) لوگوں کے لئے شفا بھی ہوتی ہے۔ یقیناً شہد کی مکھیوں کے نظامِ کارکردگی میں، ان کے لئے، جو فکر و تدبّر سے کام لیتے ہیں، بڑی نشانیاں ہیں۔ (تو کیا تم اب بھی فَمِن اللّٰہ کا انکار کرو گے؟)۔

سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ط کا مفہوم

ذُلُلًا: کے معنی ہیں ''مقصد کے حصول کے لئے فرماں پذیر انداز میں سرگرم عمل ہونا، مقصد کے حصول کے لئے قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہوئے سرگرم عمل ہونا''۔

سُبُلَ: سبیل کی جمع ہے اور معنی ہیں ''راستے''۔ اگر بلا مقصد سفر ہو تو وہ آوارگی ہوتی ہے۔ اگر سفر مقصد کو ملحوظ رکھ کر کیا جائے تو وہ سفر با مقصد ہوتا ہے۔ رَبِّک ''تیرے رب کا نظام ربوبیت''۔

شہد کی مکھی اپنے فریضہ میں خیانت نہیں کرتی، جو زندگی بسر کرنے کے لئے انسانوں کے لئے محسوس مثال ہے شہد کی مکھیوں کی زندگی میں، انسانوں کے لئے خدا کا نظام ربوبیت محسوس طور پر سامنے آجاتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، ایک مکھی صبح سے شام تک اپنے جسم کے وزن سے پانچ سو گنا زیادہ وزنی شہد کا مادہ چوس کر لاتی ہے۔ اسے شہد کی ایک چمچی بنانے کے لئے دو ہزار پھولوں میں سے رس چوسنا پڑتا ہے۔ اسے ایک پونڈ وزنی شہد بنانے کے لئے اپنے چھتّے سے پھولوں تک جانے کے لئے 37,000 مرتبہ ان راستوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام راستوں کے سفر کا اوسط فاصلہ 50,000 میل ہوتا ہے، یہ ہے وہ انداز جسے قرآن کریم نے سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ط (16:69) کہا ہے۔ سارا دن شہد کی مکھی چاروں اطراف میں، مختلف راستوں پر پھولوں کا رس چوسنے کے لئے سفر کرتی ہے، فضا کے اندر کوئی نشانِ راہ بھی نہیں ہوتے، لیکن اپنے چھتّے کو کبھی نہیں بھولتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مکھی کسی دوسرے چھتّے میں چلی گئی ہو۔

مکھی کبھی یہ نہیں کہتی کہ رس چوس کر تو میں لائی ہوں اور تقسیم دوسروں میں بھی کیا جا رہا ہے۔ ہر مکھی ہم کو ایک جیسی نظر آتی ہے، لیکن یہ اپنے اپنے کام کی مناسبت سے صلاحیّت کا فرق رکھتی ہیں۔ چھتّے کا ہر فرد اپنی صلاحیّت کے مطابق کام کرتا ہے۔ ان کی صلاحیّتیں مختلف اس لئے ہوتی ہیں کہ انہوں نے مختلف کام کرنے ہوتے ہیں، اس لئے تقسیم عمل کے لئے یہ اختلافی مدارج ہوتے ہیں ایک مومن کی زندگی کا بنیادی نصب العین۔ اجتماعی زندگی یا نظام ربوبیّت کی بہترین مثال، شہد کا چھتّہ اور شہد کی مکھی کی زندگی ہے۔ دراصل شہد کے چھتّے کے نظامِ کار کو معاشی لحاظ سے نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے ایک عملی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ شِفَآءٌ صرف جسمانی بیماریوں کے لئے نہیں کہا گیا۔ یہاں یَّتَفَكَّرُوْنَ کی بات ہے۔ ''شہد کی شفا'' جو غذا کے اعتبار سے ہے، وہ تو جسمانی بیماریوں ہی کے لئے ہے، تو اس میں تفکّر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب یَّتَفَكَّرُوْنَ بات آگئی ہے تو مفہوم یہ بنتا ہے کہ قرآن میں اور شہد کے چھتّے کے نظام میں، جو وحی کی رو سے ہی قائم ہوتا ہے، اس میں نوع انسانی کی ہر بیماری یعنی معاشرتی، معاشی، سماجی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے لئے غور کر کے شفا حاصل کی جاتی ہے۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تاکہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546
idarati@gmail.com

عمر احمد عثمانی مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(اس مضمون کی گذشتہ دو اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ، اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں والدین کے واجبات کا بیان ہنوز جاری ہے۔ موجودہ قسط میں والدین کی ذمہ داریوں پر مزید روشنی ڈالی جا رہی ہے۔)

ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح اسی پر منحصر ہے کہ آئندہ نسلیں صحیح بنیاد پر اٹھیں۔ کیونکہ انسانیت برابر ارتقائی مدارج طے کرتی چلی آ رہی ہے اور اسے یہ ارتقاء کی منازل بہرحال طے کرنی چاہئیں۔ یہ ارتقاء بتدریج ہوتا آ رہا ہے اور بتدریج ہی ہوتا ہے۔ ہر دور کی ایک منزل ہوتی ہے۔ جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج کی نسل کے وہ امکانات نہیں ہو سکتے۔ جو کل کو آنے والی نسل کے لئے ہوں گے۔ اگر ہماری آنے والی نسل اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان حدود سے آگے قدم نہیں بڑھا سکی جن حدود تک ہم آ کر رک گئے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت کا ارتقاء رک گیا اور وہ ایک نقطہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ زندگی **جحیم** کی زندگی ہے جو کسی طرح بھی قابل فخر نہیں کہی جا سکتی۔ ہوتا یہی ہے کہ ہر نسل انسانی ارتقاء میں اپنی ممکنہ حد تک سعی کرتی ہے اور آنے والی نسل اسے اور آگے بڑھاتی ہے۔ تا آنکہ انسانیت کسی نئے انقلاب سے دو چار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی انقلاب بڑے بوڑھوں کے ہاتھوں نہ برپا ہو سکا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب ہمیشہ نئی پود اور جدید نسل (New Generation) کے ہاتھوں ہی برپا ہو سکا ہے۔

ذرا بنی اسرائیل کی مثال کو سامنے لائیے۔ یہ قوم کس قدر مصائب و آلام میں گرفتار تھی۔ ملوکیت و شہنشاہیت و فرعون، سرمایہ داری اور جاگیرداری (قارون) اور پیشوائیت اور برہمنیت (ہامان) کے تین زبردست پاٹ تھے جن کے درمیان میں صدیوں سے یہ قوم پستی اور کچلتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ ہر مصیبت اپنے نقطۂ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ فلسفۂ تاریخ کے لحاظ سے جس قدر شدید یہ قوتیں تھیں۔ اتنا ہی شدید ان کا ردعمل (Re-Action) بھی ہونا چاہئے تھا۔ انقلاب کے لئے اس سے بہتر ساز گار فضا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سرزمین میں جو انقلاب پیدا کیا۔ وہ اس قوم کے بڑے بوڑھوں کے ہاتھوں رونما نہیں ہو سکا۔ جو ساری عمر ان سہ گانہ چکی کے پاٹوں میں پستے چلے آ رہے تھے بلکہ

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

(10:83)

ترجمہ: فرعون اور اس کے سرکردہ لوگوں کے اس خوف کے باوجود کہ وہ انہیں کسی نئی آزمائش اور ابتلا میں نہ ڈال

دے۔ موسیٰؑ پر اس کی قوم کی کچھ نئی پود ہی ایمان لا سکی تھی۔ فرعون یقیناً سرزمین مصر میں بڑی قوتوں کا مالک اور بڑا ہی ظالم بادشاہ تھا۔

چونکہ ارتقاء انسانیت کی گاڑی نئی پود کے بل پوتے پر ہی آگے چلتی ہے۔ اس لئے ہر نئی پود اور ہر نئی نسل کی حفاظت انتہائی ضروری ہو جاتی ہے۔ تاکہ اس کی صلاحیتیں کہیں دب کر نہ رہ جائیں۔ اگر نئی نسل کی صلاحیتیں برگ و بار نہ لا سکیں اور دب کر رہ گئیں تو انسانیت کی گاڑی جہاں کی تہاں رہ جائے گی۔ اور ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اس لئے ہر نسل کا یہ فرض اولیں ہے کہ وہ اپنی آنیوالی نسل کی صحیح تربیت کر کے اس کی صلاحیتوں کو اتنا اجاگر کر دے کہ وہ انسانیت کی اس گاڑی کو اس منزل سے آگے لے جا سکیں جہاں موجودہ نسل اسے چھوڑ رہی ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم پوری انسانیت کو ''جحیم'' کے اس غار میں دھکیل دیتے ہیں جہاں انسانیت رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جحیم قرآن کی اصطلاح میں اس معاشرہ کا نام ہے جہاں کاروانِ انسانیت رک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ارتقائی مدارج طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ عربی زبان میں جحیم وہ ماحول ہے جہاں کوئی رک کر کھڑا ہو جائے اور آگے نہ بڑھ سکے۔

آنے والی نسل کو صحیح تربیت نہ دینا اور اس کی صلاحیتوں کو اجاگر نہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں نسل کشی کہلاتا ہے جو اتنا بڑا اجرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے ہاں اولاد کی طرف سے بے اعتنائی اور بے توجہی بڑی عام تھی۔ وہ اولاد کی پرورش کو اسی حد تک ضروری سمجھتے تھے جس حد تک حیوانی جبلت کے مطابق فطری طور پر وہ مجبور ہوتے تھے۔ جہاں بچہ اس قابل ہوا کہ وہ نیچے سے اوپر آ جا سکے اور کچھ کام دھندا کر سکے۔ وہ بالکل اس سے بے توجہ ہو جاتے تھے، بچہ جہاں آٹھ نو سال کا ہوا اور اس قابل ہوا کہ وہ جنگل میں جا کر اونٹ اور بکریاں چرا سکے تو وہ اس کی غور و پرداخت سے آزاد ہو جاتے تھے، یہ بچے اپنا پیٹ بھرنے، بلکہ ماں باپ کے لئے بھی کچھ کما لانے کے لئے دوسروں کی نوکری او رمزدوری کرنے کے لئے نکال دیئے جاتے تھے۔ اولاد کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ ضرورت پڑتی تو وہ ان کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ سرمایہ دار یہودیوں کے ہاں چند وسق کھجوروں کے بدلے ان کو رہن بھی رکھ دیتے تھے۔ عرب معاشرہ کی یہ عام کیفیت تھی اور اسے کوئی عجیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی یہ کیفیت ہو وہاں اولاد کی طرف ضروری توجہ اور ان کی صحیح تربیت کے خیال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے اس کو نسل کشی (قتل اولاد) سے تعبیر کیا ہے۔

قتلِ اولاد کا مفہوم:

قتلِ اولاد سے متعلق قرآن کریم میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں۔ ایک تو وہ آیات ہیں جن میں وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ (17:31) کے الفاظ کے ساتھ اولاد کشی سے منع کیا گیا ہے۔ اس موضوع کی مختلف آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم فاقہ کشی اور تنگ دستی کے خوف کے ماتحت کیا جاتا تھا اور عربوں میں اس قدر عام تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جو مومن عورتیں بھی آپ سے بیعت کرنے آئیں آپ ان سے یہ عہد بھی لیا کریں کہ وہ نسل کشی کے جرم کی مرتکب نہیں ہوں گی۔ پھر ساتھ ہی قرآن کریم یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ جرم اکثر مشرکین میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے مراکز اطاعت (شرکاء) نے اس جرم کو ان کی نگاہوں میں بڑا ہی خوش آئند بنا رکھا تھا۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا

کہ وہ عربوں کو تباہ و برباد کر دیں۔ اور ان کے دین کو ان کے لئے مشتبہ بنا دیں۔ ان آیات سے جہاں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم عربوں میں بہت ہی عام تھا۔ وہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے محرکات کیا تھے۔ عام لوگ فاقہ کشی اور تنگ دستی کے خطرے کے ماتحت اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور ان کے دینی پیشوا ان کے سامنے اس جرم کو حسین بنا کر پیش کرتے تھے۔ جس سے ان کا مقصد عربوں کی تباہی اور بربادی اور دین کے بارے میں التباس و اشتباہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بالمقابل قرآن کریم کی وہ دوسری آیات ہیں جن میں (عام اولاد نہیں بلکہ) خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کو قتل کر دینے یا زندہ درگور کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شنیع جرم کا محرک وہ ذلت و رسوائی کا احساس ہوتا تھا جو ایک عرب کو سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اس دوگونہ مصیبت میں پھنس جاتا تھا کہ آیا اس ذلت کو برداشت کرے یا اس لڑکی کو مٹی میں دبا کر اس رسوائی سے چھٹکارا حاصل کرے۔ کچھ لوگ اس ذلت کو برداشت کر لیتے تھے اور کچھ سنگدل ایسے بھی ہوتے تھے۔ جو اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کا عام رواج عام عربوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ چند خاندانوں (یعنی ربیعہ اور مضر کی چند شاخوں میں) پایا جاتا تھا[1] یہ جرم اگر عربوں میں اتنا عام ہوتا۔ جتنا قتل اولاد کی آیات سے نظر آتا ہے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں عورتوں کی تعداد اتنی ہو سکے گی کہ ایک ایک مرد کے گھر میں دس دس بارہ بارہ بیویاں ہوتی ہوں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے عربوں کی معاشرت میں بیویوں کی یہ کثرت تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سارے عرب میں دختر کشی کی یہ رسم اس قدر عام تھی تو ان کے گھروں میں اتنی کثرت سے بیویاں کہاں سے آ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ دختر کشی کی رسم کا محرک جذبہ جیسا کہ خود قرآن کریم اور تاریخ سے واضح ہے۔ فقر و فاقہ کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ذلت اور رسوائی کا احساس ہوتا تھا۔

ان حقائق کے پیش نظر میرا خیال یہ ہے کہ پہلی قسم کی آیات میں قتلِ اولاد سے مراد دختر کشی کی رسم نہیں ہے۔ بلکہ فکری اور اخلاقی طور پر ان کو مار ڈالنا ہے اور دوسری قسم کی آیات میں دختر کشی کی رسم مراد ہے۔

چنانچہ قتل اولاد سے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ (6:140)

ترجمہ: وہ لوگ انتہائی خسارہ میں رہے جو اپنی اولاد کو محض اپنی بیوقوفی اور جہالت کی وجہ سے قتل کر ڈالتے ہیں اور جو کچھ خدا انہیں عطا فرماتا ہے۔ اسے خدا کے ذمہ تہمتیں باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں اور قطعاً درست راستہ پر نہیں چل رہے ہیں۔

یہ لوگ اپنی بیوقوفی اور جہالت سے، اخلاقی طور پر اپنی اولاد کو یوں ختم کر دیتے تھے کہ ان کی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھتی تھیں وہ اس طرح دب کر رہ جاتی تھیں کہ ان کے پھلنے پھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے قدم بڑھانے کے قابل ہی نہیں بنتے تھے۔ اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

(1) ملاحظہ ہو تفسیر المنار، ص:130، ج:8

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام کہہ دو! کہ آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں۔ خدا نے تم پر کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اور فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اس آیت میں قرآن کریم نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ نسل کشی کے اس جرم کا ارتکاب عربوں میں فقر و فاقہ کے اندیشہ کی وجہ سے کیا جاتا تھا جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں وہ اولاد کو فروخت کر دیا کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر سرمایہ داروں کے ہاں رہن بھی رکھ دیا کرتے تھے۔ بہرحال اس نسل کشی کا ارتکاب اس روایتی شرم اور عار کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا جو وہ لڑکیوں کے سلسلہ میں محسوس کرتے تھے۔ اگر آیات میں نسل کشی کے جرم کے ارتکاب کے یہ معنی لئے جائیں کہ اپنی اولاد کو سچ مچ قتل نہ کر دیا کرو تو یہ واقعہ کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اپنے بچوں کو سچ مچ کوئی بھی ذبح نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں کو بھی زندہ درگور کیا جاتا تھا تو وہ اپنی روایتی شرم اور عار کے احساس کے ماتحت کیا جاتا تھا۔ فقر و فاقہ کے اندیشہ سے نہیں کیا جاتا تھا۔ بہرحال اس قسم کی آیات میں نسل کشی سے مراد صرف دختر کشی کی وہ رسم نہیں۔ جو نہ اس قدر عام تھی جو قرآن کے اندازِ بیان سے (بظاہر) نظر آتی ہے اور نہ ہی فقر و فاقہ کے اندیشہ کے ماتحت وقوع پذیر ہوتی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عربوں میں ایسا بھی کوئی رواج ہوگا کہ وہ فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتے ہوں تب بھی قتل اولاد کے جرم میں نسل کشی کی یہ معنوی صورت بھی داخل ہے کہ اولاد کی اخلاقی تربیت سے لاپروائی برتی جائے۔ اور اسے یوں ان گھڑ چھوڑ دیا جائے۔ یا اس کی ایسی غلط تربیت کی جائے کہ وہ بالکل ہی ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ انسان کا بچہ اگر حیوان بن جائے کہ اس میں انسانیت کی کوئی بات ہی پیدا نہ ہو تو کیا انسانیت کشی نہیں کہلائے گی تو اور کیا کہلائے گی۔ دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ (17:31)

ترجمہ: اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشہ سے قتل نہ کر دیا کرو۔ ہم ہی انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بلاشبہ اولاد کو یوں قتل کر ڈالنا بہت ہی بڑی خطا ہے۔

نسل کشی کی یہ رسم کہ اخلاقی طور پر اولاد کو بالکل ناکارہ کر کے ختم کر دیا جائے۔ ربیعہ اور مضر ہی میں نہیں تھی بلکہ عربوں میں اس قدر عام تھی کہ زیادہ تر مشرکین اس میں گرفتار تھے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ (6:137)

اس طرح بہت سے مشرکین کی نگاہوں میں ان کے شرکاء نے قتل اولاد کے عمل کو خوشنما بنا رکھا ہے تاکہ وہ انہیں تباہی کے غار میں دھکیل دیں اور اس طرح ان کے دین کو، ان پر مشتبہ کر دیں۔ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ اے پیغمبر آپ انہیں اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجئے۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

قرآن شریف کی تلاوت

ارشد خوشی خوشی گھر آیا۔ آج ان کے اسکول میں انسپکٹر صاحب معائنے کو آئے تھے اس لئے انہیں جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ (جلدی چھٹی مل جائے تو بچے شور مچاتے گھروں کو آتے ہیں)۔ اس کے ابّا نے پوچھا کہ انسپکٹر صاحب نے کیا کیا سوال کئے تھے اور بچوں نے کیا کیا جواب دیئے۔ ارشد نے بہت سی باتیں بتائیں لیکن ایک بات پر بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ ماسٹر صاحب نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو انگریزی کی ایک نظم یاد کرا رکھی تھی جسے اس نے فرفر سنا دیا۔ انسپکٹر صاحب بہت خوش ہوئے لیکن اس کے بعد انہوں نے اس بچے سے پوچھا کہ اُسے اس نظم کا مطلب بھی آتا ہے۔ بچے نے کہا کہ اُسے صرف نظم کے الفاظ یاد کرائے گئے ہیں۔ اسے انگریزی نہیں آتی۔ اس لئے اُسے نظم کا مطلب معلوم نہیں۔ اس پر انسپکٹر صاحب ناراض سے ہو گئے اور انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور ہم سب کو سمجھایا کہ جن الفاظ کا تمہیں مطلب معلوم نہ ہو انہیں رٹنے اور فرفر دُہرا دینے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ نظم اسی زبان کی یاد کرانی چاہئے جو زبان بچوں کو آتی ہو۔ اس نے یہ بات ایسی اچھی طرح سمجھائی کہ ہمارا بڑا جی خوش ہوا۔ ارشد کے ابّا نے کہا کہ بیٹا انسپکٹر صاحب نے واقعی بڑی اچھی بات بتائی ہے۔ جن الفاظ کا تم مطلب نہ سمجھو انہیں پڑھنے اور دہرانے سے فائدہ کیا ہوسکتا ہے؟

ارشد نے کہا کہ ابّا جان! یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہمیں اسکول میں قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے تو اس کے ہمیں صرف لفظ یاد کرائے جاتے ہیں۔ عربی زبان ہمیں نہیں پڑھاتے۔ اس لئے ہمیں ان الفاظ کا مطلب بالکل معلوم نہیں ہوتا۔ وہی الفاظ ہم نماز میں دہرا دیتے ہیں۔ پچھلے رمضان شریف میں حافظ صاحب نے مسجد میں قرآن شریف ختم کیا تھا۔ انہیں بھی عربی زبان نہیں آتی تھی۔ انہوں نے بھی قرآن شریف کے الفاظ یاد کر رکھے تھے۔ انہی الفاظ کو انہوں نے دُہرا دیا تھا۔

صبح کے وقت دادی اماں بہت سی سورتیں اور دعائیں پڑھتی ہیں۔ عربی تو ایک طرف، دادی اماں کو تو اردو بھی نہیں آتی۔ اس سے کیا فائدہ ہے؟ خود انسپکٹر صاحب نے ہم سے قرآن شریف کی بہت سی سورتیں سنیں اور بڑی شاباش دی۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں عربی زبان نہیں آتی۔ اس پر انہوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا! ارشد کے ابّا نے کہا کہ بیٹا! تم ٹھیک کہتے ہو۔

جن الفاظ کا مطلب نہ آتا ہو اُنہیں دہرانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا لیکن ہمارے ہاں یہ رسم چلی آتی ہے کہ قرآن شریف کو بغیر سمجھے پڑھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن شریف

بھی ایک کتاب ہے۔ اس میں بہت اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن جب ہم ایک بات کو سمجھیں ہی نہیں تو ہم اس سے فائدہ کیا اٹھا سکتے ہیں! ہمارے ہاں قرآن شریف کو خالی پڑھ لینے کا نام تلاوتِ قرآن شریف ہے۔ حالانکہ تلاوت کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ قرآن شریف کی تلاوت کے معنی ہیں اس کے احکام کی پیروی کرنا سو جب تک قرآن شریف کو نہ سمجھا جائے اس کے احکام کی پیروی کس طرح کی جاسکتی ہے؟ یاد رکھو بیٹا! قرآن شریف کو پڑھنا اس طرح چاہئے کہ وہ سمجھ میں آجائے۔ اور سمجھنا اس لئے چاہئے تاکہ اس کے احکام کی پیروی کی جائے۔ اسے تلاوتِ قرآن شریف کہیں گے نہ کہ بلا سمجھے اس کے الفاظ دہرا لینے کو۔

ارشد نے کہا ابّا جان! آپ نے آج بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا! یہ سب باتیں ہمیں قرآن شریف کے درس سے معلوم ہوئی ہیں ورنہ اس سے پہلے ہم بھی قرآن شریف کو بلا سمجھے پڑھ لینے کو تلاوت کہا کرتے تھے۔ تم بھی میرے ساتھ درس قرآن میں چلا کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا ابّا جان! میں آپ کے ساتھ درس سننے ضرور جایا کروں گا۔

قرآن کی فریاد

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

جُزدان حریر و ریشم کے، پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں

جیسے کسی طوطے مینا کو، کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں، اس طرح سکھایا جاتا ہوں

جب قول و قسم لینے کے لئے، تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے، ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

دل نور سے خالی رہتے ہیں، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو اک اک مجلس میں، پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے محبت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں

کس بزم میں میرا ذکر نہیں، کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درج ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999،
2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 1

By G. A. Parwez (Episode No.3)

(Translated by: Mansoor Alam)

Concubines were distributed as gifts. Our Fiqh books are full of chapter after chapter describing that adoption of slaves and concubines as allowed in Islam and detailing conditions and rules of how to keep and take care of them. These are all there in our religious books developed under the Abbasid rule with its capital in Baghdad. How ironic then that custodians of religion and loud proponents of Prophet's Sunnah proclaim to the world that Islam is a brotherhood of humankind; that it advocates equality and equity and justice to all!

The charter of the UNO prepared by non-Muslims outlawed slavery forever in the world. Do you know that our rulers over our holiest sites (Mecca and Medina) refused to sign this document initially claiming that our Sharia allows slavery – and since we are the protector of Sharia we will not sign the document! Later however, the next government signed the UNO charter. But there are still people who believe in the Sharia related to slavery.

Demand of having one concubine in Pakistan National Assembly

Anyway, according to religious Sharia slavery is still allowed. A Maulvi, of all places, in the National Assembly of Pakistan, made a motion that people should be allowed to have one concubine since they are not allowed to marry more than one wife under the new Family Laws. This was recorded in the proceedings and is available for anyone to see. In favor of his motion he provided the verse of the Quran مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (4:25).

The true meaning of مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

My dear friends! When Islam came, the majority of the Arab society (especially Mecca as well as Medina) was composed of slaves and concubines. The entire economy was dependent on them. The Quran explicitly forbade making of any new slaves or concubines. But what about those that were already there? The statement مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ – and it has come in many places in the Quran – is in the past tense. That means those slaves and concubines that were already there in society. If all of

them were released overnight then the society would have collapsed. So, the Quran ordered a practical step by step program of action to release them. It asked to free slaves if they would be able to establish themselves on their own, and, if need be, by providing them financial help for this purpose. It asked owners of concubines to absorb them as their wives and their kids as their own children; or release them if they are able to establish their own families. This way, after closing the door for making any more slaves or concubines, the Quran solved this complex societal problem. But, how ironic, that our religious priesthood (in cahoots with Mulukiyah) opened the floodgate of slavery and concubinage in the name of Islam by using their own man-made Sharia. They thus erected the roadblocks in the path of دین (*Deen*) of Allah.

Description of Slaves and Concubines in Abul A'la Maududi's Tafhimul Quran

As I mentioned Abbasi kings (who called themselves Khalifas) used to have thousands of concubines in their palace. Several chapters are devoted in books of Sharia – written during their rule – which allowed them to have slaves and concubines. A debate ensued between me and Abul A'la Maududi because I wrote that this was not allowed I Islam. He defended the practice of making prisoners of war slaves and concubines as being perfectly Islamic. He published a booklet about it. He also wrote it in his Tafsir of the Quran. He wrote about the women prisoners of war: that if the government wants it can release them; it wants if it wants it can accept ransom and release them; or if it wants it can exchange them with Muslim prisoners that are in enemy's hands; or if it wants it can distribute among Muslim soldiers who can use them. [*Tafhimul Quran, Vol.1, pp. 340-341*)].

When I pointed out that Quran does not say that these women prisoners can be distributed among Muslim soldiers for their use, then do you know my friends what Mr. Maududi's reply was? His reply was: your fundamental mistake is that you consider only the Quran as the source of lawmaking in Islam! No wonder, the greatest roadblock in the path of the Quran are these people.

My dear friends, I often say that I am reaching the last part of my life. I don't know whether we will get another chance to talk about these things. But let me mention this very firmly: The دین (*Deen*) of Allah will never get established unless and until we accept the Quran and only the Quran as the final authority. There is no other way except this. The moment we accept any other thing, no matter how sacred, that contradicts the Quran we go astray. Slavery is an extremely important issue. The whole world

has renounced slavery. It has been forbidden by the UNO charter. And now our custodians of religion are declaring in Parliament that we should be allowed to have at least one concubine because our Sharia allows it. If this "Islamic" system ever gets established then this Sharia laws will be implemented and making slaves and concubines will be Islamized. This is what happens my friends when we leave the Quran?

The Quran advocated fair treatment of prisoners of war. It ended forever the main source of slavery 1400 years ago: فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (47:4) – Then set the prisoners of war free either as an act of grace or after taking ransom (monetary reward) or by exchange of your own prisoners. What could be clearer than this my friends that you need outside source.

War itself will lay down its weapons

The Quran orders Muslims to fight with full might and treat prisoners of fairly and return them to your enemy for ransom or even as a favor if they cannot afford ransom. This way the war itself will lay down its weapons. The Quran is very explicit about it: حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (47:4) – till all possibilities of waging war are eliminated and peace and order returns. Please pay attention to this verse carefully. It does not say that the enemy will lay his weapons but that war itself lay will down its weapons! Allahu Akbar! War itself will be defeated. We set up commissions how to end war. Well, when the enemy does not listen to all overtures of peace and is hell bent to wipe you out, then fight as hard as possible and when the enemy is defeated – then treat them with fairness and respect. Then you will see that war itself will lay down its weapons. This will be your greatest achievement even though you will have to give ultimate sacrifice. There may arise in your hearts this thought that why Allah Himself does not punish the enemy? Yes, Allah has the complete power and authority and He can punish the enemy and wipe them out. But then you will not be able to test yourself. But then you will not be able to develop your potential. But then you will not know that, with full conviction of Iman and steadfastness and fortitude, you could yourselves defeat the enemy. And that will be your greatest achievement: ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ (47:4) – It is for this purpose that you are permitted to raise arms. Also remember that if Allah had so willed, He could have punished these opponents in other ways. However He desires that an open clash like this would clearly show how much capability you have acquired to fight against the enemy and to survive. As for those who have laid down their lives for the establishment of the Divine Order, rest assured that their deeds will not go to waste. Life is a continuous journey and does not end

with physical death.

Establishment of Divine orders happens through human hands

I have written in my book مطالب الفرقان "*Mataalibul Furqan*" how Allah fulfils His responsibilities through human hands. For example, take this matter of war. The Quran says: قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰـهُ بِأَيْدِيكُمْ (9:14) – So wage war against them. Allah will chastise them through your hands. Then only you will prove to the world that you are on top of the world: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (3:139) – You shall surely be uppermost in the world, provided you are true believers. Confrontation with enemy forces is meant to test your abilities; it is meant to test whether you are worthy of this high position in the world. The usual translation of لِيَبْلُوَكُمْ (11:7; 6:165; 67:2) that "Allah tests you" is quite wrong. Allah knows everything about us; He even knows our thoughts – so He does not need to test us. It is we who need to test ourselves; to find out ourselves whether or not we are up to the task in tough and challenging situations. The essence of the Quran is to define and manifest the true position of Adam in the world.

Position of Adam in the world

What is the position of Adam (human) according to the Quran? It is to conquer the forces of Nature. And what is the position of مومن (*Momin*) according to the Quran? It is to establish divine (universal) order in the world based on divine (permanent) values. Whoever comes in the way of this must be confronted and subdued. The purpose of this confrontation must not be to take revenge or to inflict punishment. The sole purpose must be to remove opposing forces from its way so that the human caravan can reach the destination of successfully establishing the divine values in real life. Whatever sacrifice this high goal demands must be given, including the ultimate sacrifice – of giving life – which the Quran says, is actually acquiring life. It is for this purpose that Allah asks Muslims to fight – so that they can test themselves whether or not they are up to the mark. When you are up to the mark and defeat the enemy, then Allah, of course, will grant you domination in the world. But this will happen through your hands. He does not want to come in the middle of the fight and punish the enemy: قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰـهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (9:14) –So fight against them. Allah will chastise them through your hands, and put them to shame by giving you victory over them. Yes, Allah will help but only when you do your part, i.e., go out and fight the enemy. Then Allah will relieve you of the fear and anxiety of your enemies; strengthen your self-confidence. And He will help you to be steadfast against your enemies: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن

تَنصُرُوا اللّـهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (47:7) – O Momineen (مومنین)! If you help Allah then He will help you. He will make you steadfast.

How to receive help from Allah

This is the help that Allah gives. Otherwise, if He was going to directly deal with the enemies He could freeze them in an instant. But this is not the case. In the world, the confrontation is between humans and humans. Those who wish to establish divine values in the world will have to fight the evil forces in its way. Allah will help them by strengthening their resolve in their commitment to carry out this divine mission by overcoming all the obstacles in its path. That is, Allah will strengthen their Iman. This is the help that Allah gives my dear friends. He does not fulfill His responsibilities in this world directly. He does not send His angels to do the job.

My dear friends, we covered four verses of Surah Muhammad (محمّد) today. We will start our next lecture from verse five (47:5). This theme – of how Allah helps humanity and how gets His responsibilities fulfilled through the hands of Momineen (مومنین) – will continue in the next verses. It may seem strange that Allah takes the responsibility but gets them fulfilled through human hands. But there is nothing strange about it if we look at it holistically. For example, He has taken responsibility that He will provide sustenance to all of humanity. What it means is that He has created the sources of sustenance; and He has given His guidance to distribute His sustenance. So, if *His* guidance is followed to distribute *His* sustenance to humankind then, obviously, it means that *He* is providing the sustenance although it is reaching through human hands.

We will continue the details in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2

(Episode No.1)

My dear friends, today is January 22, 1982 and today's lecture starts with verse (47:5) of Surah Muhammad (محمّد). The first two verses continue the theme from the last lecture. The words فِي سَبِيلِ اللهِ has appeared in more that forty places in the Quran. Its literal translation is: in the way of Allah which means to struggle in the cause of Allah; which means to struggle – and even give one's life – for the goals that Allah has set for humanity. This struggle must lead to improving the human condition; it must lead to advancement of humankind; it must lead to uplifting of the human ship. This would be the practical way to test whether or not Allah's guidance is being followed; whether or not we are treading the

The Quran says: سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ; وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (47:5-6) – Allah will guide them to their destination and improve their condition. And He will bless them with a blissful and very pleasant heavenly life which has been introduced to them earlier. One thing I want to make it absolutely clear my friends: We must believe in Jannah and Jahannam of the Hereafter. But the Quran proclaims that if its guidance is followed in practical life then humankind will see the Jannah here, in this world as well; that human society will reflect the characteristic of Jannah here in this world. On the contrary, if Allah's guidance is not followed then the world will become Hell – as it has become now. The Quran explains in metaphorical terms the Heaven and Hell of the Hereafter; it explains them through examples; it exemplifies them through parables. This is because human mind cannot comprehend events that will happen after death.

However, humans not only can see but they can experience Heaven and Hell here in this world. Well, we have not had a chance to see or experience heaven here; but as far as Hell is concerned, we can easily see that we are engulfed in it right now. The current condition of Muslims in the world is pathetic, to say the least. Muslims everywhere are at the receiving end. This can only point in one direction; that we have lost our way; that we have left Allah's guidance; that we left the Quran (25:30).

The next verse is extremely important. Please note down the points. If we ask what is the purpose of the Quran in few words? Then the short answer is: (i) it makes man become aware of his true position in the Universe; and (ii) it provides the true concept of Allah. No one else can provide this concept except Allah Himself which is now preserved in the Quran – because the Quran is the only book that Allah has taken the responsibility to protect and to preserve forever. A Western philosopher – perhaps Locke – has said that if you tell me what kind of concept a people have about God then I will tell you everything about them: their social, economic, psychological, and mental conditions.

My dear friends, whatever the Quran has said about these two things you cannot find them in any other religious book. I am not saying this for argument sake which, in my past life, I used to engage in quite a lot. But I am telling this with full knowledge and understanding because I have deeply studied all religious books. And I could not find these two things anywhere. This teaching: introducing to man his own proper place in the Universe; and providing the true concept of God – is unique to the Quran. It says: لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (21:10) – We have revealed this Quran in which lies the secret of your own dignity and glory. If you apply

reason and intellect then you will be able to understand this reality. Then, it will become clear to you that this Quran is given to you for advancing your *own* humanity. Allah has no personal stake in this.

In Arabic language ذِكْر (*Dhikr*) does not only mean what we normally understand: "to describe" something; but it also means "dignity"; it also means "eminence." The Quran says: وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (43:44) – It is a fact that this Quran shall indeed become a source of eminence for you O Prophet (PBUH) and your people. And in another place the Quran says: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُم بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ (23:71) – Tell them O Prophet that if the truth were to follow the desires and whims of people, then there would be total chaos in the universe. Nothing would stay in its proper place. Everything would turn topsy-turvy. Just consider their attitude! We gave them this Quran which ensures them dignity, grandeur, excellence, elevation in status and honor; and yet they are turning away from all this.

There is no human being whose thought is not colored by his feelings and emotion. And it is the heart that is the source of whims, desires, and emotion. It is not possible for human beings to create laws in which human emotion is not involved. Once humans are involved in lawmaking it is impossible for the laws not to be colored by their emotions. No matter how much they try to avoid emotion consciously, it will enter through their subconscious mind.

THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) is above emotion

The reality of Allah is beyond emotion. It does not get influenced by emotion. Therefore, the lawgiver can only be Allah. This is the reason Allah says in the Quran (23:71) that if your emotion gets involved in decision making, then the entire Universe will collapse. We know that one person's emotion is different from another person's emotion. As a consequence there is clash of emotions among humans. If a universal law gets influenced by emotion then you can very well imagine what kind of destructive law that would be. That is why there should be no place of emotion in lawmaking. Having clarified this, the question then is: what is the purpose of the law that Allah has given? Well! It is for humans' own good: بَلْ أَتَيْنَاهُم بِذِكْرِهِمْ (23:71) – In it lies the secret of their own dignity; the secret of their own grandeur; and the secret of their own merit and honor.

The Quran wants to elevate the status of man but he strays from it

The Quran describes that Allah wants to raise man's status but he does not want it: فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ (23:71) – Look at his stupidity! Allah wants to raise his status but he turns away from it. Think about it! We want to give him dignity and he does not want it! How thoughtless could

he be! He wants to go down into harrowing pit by following his emotions. Here We are! We want to raise his status and he wants to go down into emotional hell of destruction! We have described in this Quran details of his emotional and psychological conditions for his own benefit but he does not pay attention. Iqbal puts it amusingly when he says:

Muhammad is yours; Gabriel is yours; Quran is yours;
But is this beautiful word expression of mine or yours!

Yes, the Quran itself proclaims that it defines and provides true understanding of man. My dear friends, please reflect and ponder on this fact: Allah sends down the Quran as a guidance for entire humanity; it will remain unchangeable and protected forever; in it are descriptions of human beings; and it talks to humans about elevating human dignity and advancing their humanity. From this it shows how high a position the Quran assigns to man in this Universe. This is a challenge to all religions: produce an evidence of this from your religious books?

The light of human life is lit from the true concept of God

I mention this because I have studied all religions. I did not find this concept of man anywhere. The next thing is the concept of God. This is an extremely important matter. The kind of concept a people have of God will be reflected in their behavior and character. The true concept of God can only be given by God. Nobody else can do that. God is beyond human thought. Human mind is limited but God is infinite. Therefore, how can infinite concept fit within finite mind? Allah has given His concept in the Quran. It is not a product of human mind. Allah has introduced Himself and provided details of His concept in the Quran.

To be Continued

Matrimonial

We are seeking for our son, A UK Born (Pakistani origin) Quran only boy aged 24, a match for marriage with a Quran only girl from anywhere around the world (preferably from Pakistan).
She must have a good command of English, aged 22-25 years old. Educated to a minimum of matriculation.
His CV will be provided upon request.
Please contact by whats app/mobile/ viber + 44 782 486 1228 or email to globalrefractorysolutions@gmail.com

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
6

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید پر ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ ضابطۂ حق وصداقت آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے نکار کر دے لیکن وہ اتنا سمجھ لے کہ ان قوانین سے انکار کر کے دوسری راہیں اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی کا وہ عذاب ہے جو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جب وہ اس عذاب کی تلخی اور شدت کے خلاف فریاد کریں گے تو اس مصیبت کو کم کرنے والی کوئی چیز انہیں نصیب نہ ہوگی۔ بلکہ وہی سامان جو مساعد حالات میں، ممدِ حیات ہوتا ہے، ان کے لئے وجہ ہلاکت بن جائے گا۔ وہی سونا چاندی جس کے بل بوتے پر یہ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ اسے پگھلا کر ان کے حلق میں انڈیلا جائے گا۔ (9:34-35) کس قدر ہلاکت انگیز ہوگا یہ تلخابہ اور کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوگا وہ سہارا جسے وہ اپنے لیے وجہ آسائش سمجھا کرتے تھے؟ (18:29)

(مفہوم القرآن، سورۃ الکہف:29 سے اقتباس)